سعودی عرب کے قومی دن
پر خصوصی شمارہ....

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

ستمبر ۱۹۹۵ء

لذّت، صحت اور توانائی!
کوئس®
جام جیلی اور مارملیڈ
QUICE Pineapple Jelly
QUICE Orange Marmalade
QUICE Apple Jam
QUICE Black Currant Jam
QUICE Mango Jam
QUICE Mixed Fruit Jam
QUICE Apple Jelly
کوئس
کوئس فوڈ انڈسٹریز لمیٹڈ، حطّار
مارکیٹنگ ڈپارٹمنٹ
فون: 4933061 - 4944529

صحافت دم توڑ رہی ہے

کئی رسالے بند ہو چکے ہیں
بہت سے بند ہونے والے ہیں
اخبارات کے مالکان کی انجمن
"اے پی این ایس"
روزانہ چیخ رہی ہے!

"مملکت کا چوتھا ستون لرز رہا ہے"

کیونکہ کاغذ مہنگا ہو گیا ہے
مہنگائی کا ذرا اندازہ لگائیے:

فروری ۹۴ء — کاغذ فی رم — =/۲۳۵ روپے
مارچ ۹۵ء — کاغذ فی رم — =/۴۷۵ روپے
۱۵ اگست ۹۵ء تک۔ کاغذ فی رم — =/۵۶۰ روپے

ایک سال میں کاغذ کی قیمت دو مرتبہ اور دو گنے سے زیادہ بڑھ چکی ہے۔ دوسرے اخراجات میں اضافہ اس کے علاوہ ہے۔ اب ایسی صورت میں ہمارے لیے رسالے کی قیمت بڑھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ اب پرچے کی قیمت ۱۶ روپے کے بجائے ۱۸ روپے ہوگی۔

ہمیں آپ شکایتوں کا بھی علم ہے لیکن ذرا سوچئے ہم کس سے شکایت کریں۔ حکومت کاغذ پر ڈیوٹی کم کر دے تو کاغذ کی قیمت بھی کم ہو سکتی ہے۔ از راہِ کرم صدر پاکستان، وزیرِ اعظم پاکستان اور وفاقی وزیرِ اطلاعات و نشریات کو خط لکھئے اور کاغذ کی ڈیوٹی میں کمی کرنے کی درخواست کیجئے۔

ان شخصیات کے پتے یہ ہیں:

صدر پاکستان جناب فاروق لغاری، ایوانِ صدر اسلام آباد
وزیرِ اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو، پرائم منسٹر سیکرٹریٹ، اسلام آباد
وفاقی وزیرِ اطلاعات و نشریات جناب خالد کھرل، وزارت اطلاعات و نشریات، اسلام آباد

اِن شخصیات کو ضرور خط لکھئے۔ شاید بچوں کے اصرار پر حکومت اپنی پالیسی بدل دے۔!!

ادارہ آنکھ مچولی، کراچی

ظلم اور دہشت کے خلاف ایک احتجاج

آنکھ مچولی کا

خصوصی شمارہ

مقتول بچے نمبر

ایک خصوصی دستاویز

دسمبر ۱۹۹۵ء میں منظرِ عام پر آرہا ہے

وہ پھول سے کومل بچے
جو گلی کوچوں میں بے گناہ قتل کر دیے گئے
اسکول جانے والے بچے
جو اسکول سے لوٹ کر گھر نہیں آئے
تاوان وصول کرنے کے لیے اغوا کیے جانے والے بچے
جن کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا
اور وہ تمام بچے
جو کسی نہ کسی ظلم اور دہشت کا شکار ہو گئے

ان بچوں کے بارے میں آنکھ مچولی میں
جیتے جاگتے فیچر، جیتی جاگتی تصویریں، المناک کہانیاں، اداس کر دینے والی نظمیں، مظلوم والدین کے انٹرویوز

آپ بھی لکھئے

اگر آپ کے شہر یا محلے میں ایسے کسی بچے کا اغوا یا قتل ہوا ہو تو معلومات جمع کیجئے اور مضمون یا فیچر تحریر کیجئے۔
یہ ایک قومی خدمت بھی ہوگی اور تحریر کا معاوضہ بھی ملے گا۔

مضامین بھیجنے کا پتہ: مدیرِ اعزازی ماہ نامہ آنکھ مچولی، ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

کراچی

ماہنامہ

آنکھ مچولی

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن پاکستان جنرلز میگزین سوسائٹی

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت

ربیع الثانی / جمادی الاول ۱۴۱۶ھ ستمبر ۱۹۹۵ء

شمارہ ۳

جلد ۱۰

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

منتظم اعلیٰ
تجمل حسین چشتی

مدیر اعزازی
طاہر مسعود

مجلس ادارت
منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

مینیجر اشتہارات
عمران احمد

مصور
مومن رحیم

فون نمبر: ۳۹۴۲۸۵۷ ۳۹۴۸۲۱۰

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضیاءالدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۷، اے-پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

قیمت: ۱۸ روپے
۷ درہم ۷ ریال

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاہد علی۔ مطبع: لائف پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ کراچی

Adarts-HRA-5/95

حسنِ ترتیب

سنہرے حروف — ادارہ — ۸
ماہِ رواں کی پہلی بات — اداریہ — ۹
نعت رسولِ مقبول (نظم) — امان اللہ نبی شوکت — ۱۰
رسول اللہ کے والد ماجد — عبدالستار خان طاہر — ۱۱
محنت کی کمائی — فضل حق خان — ۱۴
شجاعت کے سترہ دن — محمد ہشام — ۱۶
جھکے ہوئے شانے — شازیہ فرحین — ۲۰
چھ ستمبر (نظم) — افشاں بشیر — ۲۶
اکبر الہ آبادی — ڈاکٹر اسلم فرخی — ۲۸
قائد موت کے دوراہے پر — محمد جاوید خالد — ۳۳
قلم آشنا — محمد مجاہد منہاس — ۳۸
ننھی گڑیا (نظم) — سید انیس احمد — ۴۳
جانور باتیں کیسے کرتے ہیں — نگہت آرا چوہان — ۴۴
ملاپ — نزہت کلیم — ۴۹
لوگ کیا کہیں گے؟ — منیر احمد راشد — ۵۷
میں ایک نوجوان ہوں (نظم) — عبدالقادر — ۶۲
وہ شاخ ہی نہ رہی — محمد ظریف — ۶۴
دیوار کے کان — فرزانہ روحی — ۶۸
کشتیاں اور جہاز — ریحانہ منیر — ۷۵
پہیلی (نظم) — تنویر پھول — ۷۸
ہنستے ہنستے — منتخب لطائف — ۷۹
اب میں کیا کروں — ادارہ — ۸۳
سوال آدھا جواب آدھا — محمد بن مالک — ۸۶
بنام آنکھ مچولی — خطوں کے جواب — ۸۸
مرغا، چوہا اور لال مرغی — نعیم مشتاق نومی — ۹۱
بلی کا خواب (نظم) — محمد بن مالک — ۹۹
کہانی انسان کی — اسحاق منصوری — ۱۰۱
قلم دوست — ننھی تحریریں — ۱۰۷

سنہرے حروف

ایران کے ایک صوبے کا حاکم ہرمزان اسلام کا بدترین دشمن تھا۔ اس نے مسلمانوں کے خلاف بہت سی جنگیں لڑیں اور آخر کار شکست کھا کر گرفتار ہوگیا۔ گرفتاری کے بعد اس کا خیال تھا کہ اسے قتل کردیا جائے گا لیکن مسلمانوں نے اس شرط پر اسے آزاد کردیا کہ وہ خلیفہ کو ایک خاص ٹیکس ادا کرتا رہے گا۔

ہرمزان اپنے ملک واپس پہنچا اور پہنچتے ہی اس نے پھر بغاوت کا اعلان کردیا اور ایک زبردست لشکر اکٹھا کر کے مسلمانوں پر حملہ آور ہوگیا۔ لیکن اسے پھر شکست ہوئی اور ہرمزان کو قیدی بنالیا گیا۔ یہ حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ ہرمزان کو آپؓ کے سامنے پیش کیا گیا۔

حضرت عمرؓ : کیا تم ہی ہرمزان ہو جس نے مسلمانوں سے کیا ہوا معاہدہ توڑ دیا؟

ہرمزان : جی ہاں!

حضرت عمرؓ : تمہیں معلوم ہے کہ اس جرم کی سزا موت ہے!

ہرمزان : جی ہاں!

حضرت عمرؓ : تو کیا تم اس سزا کے لئے تیار ہو؟

ہرمزان : تیار ہوں لیکن مرنے سے پہلے میری ایک التجا ہے کہ پہلے تھوڑا سا پانی پلوا دیجئے (ہرمزان کو پانی دیا گیا اس نے پانی کا پیالہ ہاتھ میں لے کر کہا):

ہرمزان : مجھے خوف ہے کہ ادھر میں پانی پینے لگوں اور ادھر میرا سر نہ کاٹ لیا جائے۔

حضرت عمرؓ : جب تک تم پانی نہیں پی لوگے تمہیں کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔

ہرمزان : امیرالمومنین! اب جبکہ آپ نے یہ قول دے دیا ہے کہ جب تک یہ پانی نہ پی لوں، کوئی مجھے ہاتھ نہیں لگائے گا۔ لیجئے میں یہ پانی نہیں پیتا۔ (یہ کہہ کر اس نے پانی کا پیالہ پھینک دیا) اب آپ مجھے قتل نہیں کرسکتے۔

حضرت عمرؓ : ہرمزان! یہ چال تم نے خوب چلی۔ بہرحال قول دے چکا ہوں اور اس پر قائم ہوں۔ جاؤ تم آزاد ہو۔

اس واقعے کے کچھ عرصے بعد ہرمزان نے اپنے بہت سے ساتھیوں کے ساتھ اسلام قبول کرلیا جو کام مسلمانوں کی تلوار نہ کرسکی وہ کام وعدے کی پابندی سے انجام پاگیا۔

پہلی بات

دوسری جنگ عظیم کا واقعہ ہے۔

جرمنی کے ایک لڑاکا طیارے کے ہواباز کو برطانیہ کے ایک مشہور تعلیمی ادارے پر بمباری کرنے کا حکم دیا گیا۔ ہواباز کے لئے یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ کیونکہ اس نے نوجوانی میں اسی تعلیمی ادارے سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اس کا ماضی آکھڑا ہوا' کالج کے کلاس روم' اس کے لان' اس کے اساتذہ اور سب بھولی بسری باتیں۔ ہواباز نے حکم ماننے سے انکار کردیا۔ اس نے کہا' آج میں جو کچھ ہوں' اسی ادارے کی وجہ سے ہوں لہٰذا اس ادارے کو میں خود اپنے ہاتھوں کیسے تباہ کرسکتا ہوں۔

ہر آدمی کی زندگی میں ایسے لمحے آتے ہیں جب اسے فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ آیا وہ احسان ماننے والا ہے یا احسان کو بھول جانے والا۔ جرمنی کے ہواباز نے تو اپنا کردار ثابت کردیا۔ لیکن ایک پاکستانی کی حیثیت سے ہم سب کو بھی سوچنا چاہئے کہ اپنے ملک کے ساتھ ہمارا سلوک کیا ہے۔ اور یہ جاننا کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ بس ذرا ان سوالوں پر غور کرلیجئے' جواب خود بخود مل جائے گا۔

- آپ کے سامنے اگر کوئی پاکستان کے خلاف زہر اگلے تو کیا آپ خاموش رہتے ہیں؟
- کیا آپ کا دل بھی چاہتا ہے کہ بڑے ہو کر پاکستان کو چھوڑ کر امریکہ یا یورپ چلے جائیں؟
- کبھی بجلی چلی جائے۔ پانی نہ آئے' گٹر کھلے ہوں یا ایسی ہی کسی بات سے تکلیف پہنچے تو آپ بھی اپنے ملک کو برا بھلا کہتے ہیں؟
- کیا کوئی قانون توڑ کر آپ کو خوشی ہوتی ہے؟
- کیا آپ کبھی سنجیدگی سے سوچتے ہیں کہ کم از کم آپ کی ذات سے پاکستان کو نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔؟
- کیا آپ بھی ایسی جرسی یا شرٹ پہنتے ہیں جس پر "ادامریکہ" یا اس قسم کے دوسرے الفاظ لکھے ہوئے ہوتے ہیں؟
- کیا آپ بھی سرکاری املاک اور سرکاری چیزوں کو پرایا مال سمجھتے ہیں اور انہیں نقصان پہنچانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے؟
- کیا آپ بھی ایسا ہی سوچتے ہیں کہ جب سب غلط کام کررہے ہیں تو آپ کو بھی غلط کام کرنے میں جھجھک محسوس نہیں کرنی چاہئے؟

ان سوالوں کا جو بھی جواب آپ کا ضمیر دے' آپ اس کی روشنی میں خود اپنے بارے میں فیصلہ کرسکتے ہیں اور پھر یہ دیکھ سکتے ہیں کہ آپ جرمنی کے اس ہواباز سے بہتر ہیں یا نہیں۔ آپ کا دوست

طاہر مسعود

نوکِ قلم سے شانِ رسالتؐ کے سلسلے
میں لکھ رہا ہوں، صبحِ صداقت کے سلسلے

پتھر رسول پاکؐ نے باندھے ہیں پیٹ پر
اور اس سے بڑھ کے کیا ہوں قناعت کے سلسلے

برسیں کہاں نہیں تری رحمت کی بدلیاں
پہنچے کہاں نہیں تری رحمت کے سلسلے

کونین کی فضا میں قیامت کے بعد بھی
جاری رہیں گے آپؐ کی مدحت کے سلسلے

نورِ نبیؐ ہے آج بھی اس بات کی دلیل
اب تک فنا کے گھاٹ ہیں ظلمت کے سلسلے

نیّر یہ واقعہ ہے کہ ذاتِ خدا کے بعد
میرے نبیؐ پہ ختم ہیں عظمت کے سلسلے

رسول اللہ کے دادا جان

عبدالستار خان طاہر

ظہور اسلام سے پہلے عرب مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر قبیلے کے اپنے اپنے بت اور اپنے اپنے رسم و رواج تھے۔ ان قبیلوں میں ایک قبیلہ قریش تھا۔ یہ قبیلہ مزید دس شاخوں میں بٹا ہوا تھا۔ جن میں ایک شاخ "بنو ہاشم" کی تھی۔ اس کے سربراہ حضرت عبدالمطلب تھے۔ جو بعد میں حضورؐ کے دادا بنے۔ (چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے) پہلے پہل عبدالمطلب کے ہاں کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ انہوں نے خدا سے اولاد نرینہ کی دعا مانگی اور یہ نذر بھی کی کہ اگر خدا نے مجھے دس بیٹے عطا کئے تو میں اپنے دسویں بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کردوں گا۔ خدا نے ان کی دعا کو قبول کرلیا اور ان کے ہاں دس بیٹوں نے جنم لیا۔ اور ان کا آخری فرزند جس کا نام عبداللہ تھا۔ عبدالمطلب کے دوسرے بچوں کے مقابلے میں زیادہ خوبرو اور حسین دکھائی دیتا تھا۔ عبدالمطلب اپنے دسویں بیٹے کی پیدائش کے بعد عبداللہ کے جوان ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ کیونکہ قربانی کرنے کی ایک شرط یہ تھی کہ وہ لڑکا بالغ ہوجائے اور اس وقت عبدالمطلب خود اپنے بیٹے کے گلے پر چھری چلا کر قربانی کا فریضہ ادا کریں۔ جیسے جیسے عبداللہ

بڑے ہوتے گئے ان کی خوبصورتی اور وجاہت میں اضافہ ہوتا گیا۔ بہرحال عبداللہ کے بالغ ہو جانے کے بعد ان کے والد نے اپنے عہد کو پورا کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ جزیرۃ العرب کے باشندے چاہے ان کا تعلق قبیلہ قریش سے ہوتا یا دوسرے قبیلوں سے، اپنے عہد کا پاس کرتے تھے اور جب بھی ادھار لیتے تو اپنا قرض مقررہ وقت پر ادا کرتے اور اگر کوئی وعدہ کرتے تو اسے مقررہ وقت پر پورا کرتے تھے۔ ایک بدوی شخص جیسا سوچتا اسی کو زبان پر لاتا اور اس کی سوچ اور کلام میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ اسی لئے عبدالمطلب اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اپنے عہد کو پورا کریں خاص طور پر اس لئے بھی کہ وہ ایک "حنیف" تصور کیے جاتے تھے۔ اور حنیف اسے کہا جاتا تھا جو سچے خدا اور آسمان و زمین کے حقیقی خالق کی تلاش میں ہو۔ اس وقت مکہ میں چند لوگ (کہ جن کا نام واضح طور پر تاریخ میں آیا ہے) ایسے تھے جن کا شمار حنیفوں میں ہوتا تھا اور عبدالمطلب ان میں سے ایک تھے۔ عبدالمطلب اگرچہ حنیف تھے تاہم اپنے باپ دادا کے خداؤں کا انکار نہ کرتے تھے اور ان میں سے کچھ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ عبدالمطلب اگرچہ یہ جانتے تھے کہ عبداللہ کو قربان کرنے کے علاوہ ان کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تاہم انہوں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا کہ وہ خدا جس کی تلاش میری زندگی کا نصب العین ہے وہ بہت عظیم اور بے نیاز ہے اور میں جو اس کا بندہ ہوں جب یہ دیکھتا ہوں کہ جس کو میں نے قرض دے رکھا ہے وہ اپنا قرض ادا کرنے کے قابل نہیں ہے تو میں اسے قرض معاف کردیتا ہوں۔ تو کیا وہ خدا جس نے اس زمین اور آسمان کو پیدا کیا ہے وہ اپنے ایک ادنیٰ بندے (یعنی عبدالمطلب) کے قرض کو معاف نہیں کرسکتا۔ لیکن عبدالمطلب یہ کیسے جان سکتے تھے کہ خدا ان کی قربانی میں چھوٹ دے سکتا ہے یا نہیں؟ اس بات کی وضاحت کے لئے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کسی "عارف" یعنی ایسے شخص سے مدد لی جائے جو آسمانی علوم سے واقفیت رکھتا ہو۔ ان دنوں یثرب کے شہر (آج کا مدینہ) میں ایک عارف رہتا تھا جو آسمانی احکامات اور اشاروں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ عبدالمطلب ایک اونٹ پر سوار ہو کر یثرب کی طرف روانہ ہوگئے۔ عبدالمطلب اونٹ پر سوار گیارہ دن کا سفر طے کرنے کے بعد یثرب پہنچے اور سیدھے اس عارف کے ہاں حاضر ہوگئے اور اس کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کردیا۔ عارف نے آسمان کے ستاروں پر نظر ڈالنے کے بعد کہا کہ وہ خدا جس سے تو نے دس بیٹوں کی آرزو کی تھی وہ

اس شرط پر تیرے دسویں بیٹے کے خون سے چشم پوشی (معاف کرنے) پر رضامند ہے کہ تو اس کا خون بہا ادا کرے۔ جزیرہ العرب میں انسانی خون کی قیمت اونٹ کی شکل میں ادا کی جاتی تھی لہٰذا عبدالمطلب نے عارف سے پوچھا کہ اگر میں دس اونٹ خون بہا کے طور ادا کروں تو کیا خدا راضی ہوجائے گا؟ عارف نے دوبارہ آسمان کی طرف دیکھا اور نفی میں سرہلادیا۔ عبدالمطلب نے رفتہ رفتہ اونٹوں کی تعداد جب ایک سو تک بڑھادی تو اس وقت عارف نے کہا کہ خدا نے تیرے خون بہا کو قبول کرلیا ہے۔ اس کے بعد عبدالمطلب مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کی جگہ خدا کی راہ میں ایک سو اونٹوں کی قربانی دے دی۔ برسوں بعد جب عبداللہ کے اکلوتے بیٹے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبری کے رتبے پر فائز ہوئے اور ان پر قرآن نازل ہوا تو خدا نے انسانی قتل کے خون بہا کے لئے ایک سو اونٹ مقرر کیے لیکن اس شرط پر کہ وہ قتل جان بوجھ کر کسی قبائلی منصوبے کے تحت واقع نہ ہوا ہو۔ جب عبداللہ کی جان خدا کی طرف سے بخش دی گئی اور ان کی بجائے ایک سو اونٹوں کی قربانی دے دی گئی۔ تو کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے حضرت آمنہؓ کے ساتھ شادی کرلی۔ بعد میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت آمنہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے لیکن اس سے پہلے کہ آپؐ اس جہاں میں آنکھ کھولیں آپؐ کے والد عبداللہ کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوچکی تھیں۔

نوکر سے معافی

بچپن میں ایک مرتبہ سرسید احمد خاں نے غصے میں آکر اپنے گھر کے نوکر کو تھپڑ مار دیا۔ سرسید احمد خاں کی والدہ پڑھی لکھی اور بڑی سمجھ دار عورت تھیں۔ وہ بیٹے کی اس حرکت پر بہت خفا ہوئیں اور انہیں گھر سے نکال دیا۔

سرسید دو دن اپنی خالہ کے ہاں رہے پھر خالہ کو اپنے گھر بھیجا کہ وہ جاکر امی کی منت سماجت کریں خالہ گئیں تو سرسید احمد کی امی نے کہا کہ میں ایسے بیٹے کو کسی صورت میں بھی گھر میں نہیں رکھ سکتی۔ جب تک وہ خود نوکر سے معافی نہ مانگے۔

چنانچہ سرسید نے نوکر سے معافی مانگی تب کہیں جاکر والدہ نے انہیں معاف کیا۔ سرسید ماں کی اس بات کو زندگی بھر نہ بھولے۔ بڑے ہوکر انہوں نے بہت عزت اور شہرت حاصل کی مگر وہ اپنے سے کم درجے کے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ خوش اخلاقی اور نرمی سے پیش آئے اور کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیا۔

محنت کی کمائی

ترجمہ: فضل حق خان

ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی لوہار کا ایک بیٹا تھا جو بہت سست اور کاہل تھا۔ سارا دن فضول اِدھر اُدھر گھومتا رہتا۔ جب تک لوہار کام کرتا رہا پورا خاندان آرام سے گزارا کرتا رہا۔ وہ بوڑھا ہوگیا۔ زندگی مشکلات کا شکار ہوگئی تو ایک دن لوہار اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔ "ہم پر لعنت ہو ہم نے ایسا بیٹا پالا ہے جو کسی کام کا نہیں ہے۔ اور کاہل ہے اگر وہ کوئی کام نہ کرے گا تو ہم کھائیں گے کہاں سے۔ میں تو ضعیف اور لاچار ہوگیا ہوں۔ اب بھی وقت ہے کہ لڑکا کوئی کام سیکھے اور پیسہ کمائے۔ آج سے ہی شروع کردے۔" لوہار کی بیوی یہ سن کر بہت پریشان ہوئی اِس لئے کہ وہ جانتی تھی کہ اس کا بیٹا کچھ نہیں کرسکتا اور پیسہ کمانا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔

کچھ سوچ کر اس نے بیٹے کو ایک سکہ دیا اور کہا کہ جاؤ دن بھر کے لئے کہیں چلے جاؤ اور شام

کو آکر اپنے باپ کو سکہ دے دینا اور کہنا کہ تم نے کمایا ہے۔ شام کو کاہل بیٹے نے ایسا ہی کیا جیسا اس کو ماں نے سمجھایا تھا۔ باپ نے سکہ لے کر انگلیوں میں گھمایا۔ سونگھا اور پھر چولھے میں پھینک کر کہا۔

"یہ سکہ تم نے اپنی محنت سے نہیں کمایا۔"

دوسرے دن ماں نے بیٹے کو ایک اور سکہ دیا اور کہا

"گھر سے چلے جاؤ اور سارا دن دوڑ بھاگ اور اچھل کود میں گزار دو۔ شام کو تمہارا باپ تمہارے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار دیکھ کر ضرور یقین کرلے گا کہ یہ سکہ تم نے اپنی محنت سے کمایا ہے۔"

بیٹے نے ایسا ہی کیا اور شام کو سکہ باپ کو دیا۔ باپ نے سکہ انگلیوں میں گھمایا، اچھالا اور پھر چولھے میں پھینک دیا۔ "تم نے مجھے پھر دھوکہ دیا۔ یہ سکہ تمہاری کمائی کا نہیں ہے۔" باپ نے سخت لہجے میں کہا۔ ماں نے محسوس کیا کہ بیٹے کے لئے افسوس کرنا غلط بات تھی۔ جب باپ نے سکہ آگ میں پھینکا تو اس کے چہرے پر پریشانی کا کوئی نشان نہیں تھا اس لئے کہ سکہ اس نے محنت سے نہ کمایا تھا اور اسے قدر نہ تھی۔

اس پر ماں نے بیٹے کو کہا "اب تمہیں معلوم ہوگیا ہوگا کہ تم اپنے باپ کو بیوقوف نہیں بنا سکتے ہو۔ اس کو تکلیف نہ دو۔ جاؤ کچھ کام ڈھونڈو کوئی ہنر سیکھو۔ پھر کچھ پروا نہیں کتنا پیسہ کماتے ہو۔ جو بھی کماؤ لاکر باپ کو دو۔ اس کو بتادو کہ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو۔"

بیٹا چلا گیا اور پورا ہفتہ ادھر ادھر گھروں میں کھیتوں میں جو چھوٹے موٹے کام ملے کرتا رہا۔ اور اپنی محنت سے کچھ پیسہ جمع کرلیا۔ جو اس نے آکر اپنے باپ کو دیا۔

باپ نے سکے دونوں ہاتھوں کی مٹھی میں گھمائے، سونگھے، اوپر اچھالے اور پہلے کی طرح آگ میں پھینک دیئے۔ "مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ تمہاری کمائی کے سکے ہیں۔"

بیٹا یہ دیکھ کر آگ کی طرف لپکا اور سکے نکالنے لگا۔ "یہ آپ نے کیا کیا ؟ میں نے..... پورا ہفتہ صبح سے شام تک محنت کی اور یہ پیسے کمائے اور آپ نے آگ کی نذر کردیئے۔"

باپ بیٹے کی طرف دیکھ کر مسکرادیا اور بولا، "اب مجھے یقین ہے کہ تم نے یہ سکے اپنی محنت سے کمائے ہیں۔ جو سکے تمہیں دیئے گئے تھے ان کو آگ میں پھینکے جانے پر تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ مگر اپنی محنت کے سکوں کو بچانے سے تم نے آگ میں ہاتھ ڈالنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اب میں اپنے بیٹے کے لئے شرمندہ نہیں ہوں۔"

جنگ کے 17 دن

محمد ہشام

"ہم جنگ میں شامل ہو چکے ہیں۔" یہ الفاظ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے تھے۔ جو انہوں نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو کہے۔ صدر مملکت اپنی قوم سے مخاطب تھے۔ اس قوم سے جو اپنی سرزمین کی حفاظت کے لئے کٹ مرنے پر تیار تھی۔ صدر مملکت نے مزید کہا "پاکستان کے دس کروڑ مسلمان اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک کہ دشمن فوج کے توپوں کے دہانے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش نہ ہو جائیں۔"

یہ جنگ جس کی طرف صدر ایوب خان نے اشارہ کیا تھا، پاکستان نے شروع نہیں کی تھی۔ یہ جنگ بھارت نے پاکستان کی سرحدوں پر مسلط کی تھی۔ اس جنگ کو محض دو فوجوں کے مابین ایک جھڑپ قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہ تو کفر و اسلام کا معرکہ تھا اور اس جنگ کے عظیم کارنامے ہر پاکستانی شہری کا سر فخر سے اونچا کر دینے کے لئے

کافی تھے۔

اسلام نے جہاں ظلم و زیادتی کی ممانعت کی ہے۔ وہاں کفر کے خلاف اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا حکم بھی دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

"اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہوں مگر جنگ میں پہل اور زیادتی نہ کرو۔ تحقیق اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو دن تین بجے بھارتی افواج نے جنگی قوانین کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بغیر اطلاع دیئے پاکستان کی سرحدوں پر حملہ کردیا۔ دشمن کو اپنی فتح کا پورا یقین تھا اور وہ سمجھ رہا تھا کہ اسے لاہور پر قبضہ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

غیر ملکی ذرائع ابلاغ بھی بھارت کی فتوحات کے بارے میں خبریں نشر کررہے تھے۔ بی بی سی نے تو یہ خبر نشر کردی تھی کہ لاہور پر بھارت کا قبضہ ہوگیا ہے۔ ظاہر ہے یہ بات بی بی سی کو معلوم تھی اور نہ بھارت کو کہ ہندوستان کا مقابلہ محض ٹینکوں یا توپوں سے نہیں قوت ایمانی سے ہے۔ اگلے روز یہی نشریاتی ادارے بھارتی افواج کا مضحکہ اڑاتے نظر آئے جو ایک پوری کور کے حملے کے باوجود بی۔ آر۔ بی نہر عبور نہ کرپائی تھی۔ اگلے چند دنوں میں یہ جنگ کئی محاذوں پر پھیل چکی تھی۔ دشمن کو لاہور کے علاوہ برکی، چونڈہ، چھمب، کھیم کرن، باٹا پور، راجستھان اور کشمیر کے محاذوں پر منہ کی کھانی پڑی۔

پاکستان کے عوام نے جنگ کے ان سترہ دنوں میں مکمل جذبۂ ایثار کا مظاہرہ کیا۔ ان سترہ دنوں میں پورے پاکستان میں قتل، ڈکیتی، چوری کی ایک بھی واردات نہیں ہوئی۔ فوج کے لئے گاڑیوں کی ضرورت پیش آئی تو مرسڈیز کاروں کی لمبی قطار سرحدوں پر نظر آئی۔ زخمیوں کے لئے خون کے عطیے دینے کی اپیل کی جاتی تو ہسپتالوں کے سامنے لمبی لمبی قطاریں لگ جاتیں۔ حملے کی خبر سن کر دیہاتی لاٹھیاں اٹھا کر دشمن کا سر کچلنے کے لئے سرحدوں کی طرف چل پڑے۔ غرض پوری قوم ایک سیسہ پلائی دیوار بن گئی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ایسا جذبہ تقسیم پاکستان کے بعد پہلی دفعہ دیکھنے میں آیا۔

بری فوج کے علاوہ ہماری فضائیہ کے شاہینوں نے بھی فقید المثال جرأت کا مظاہرہ.... کیا۔ سترہ روز میں دشمن کے ۱۴۱ جہاز مار گرائے۔ اسکوارڈن لیڈر یونس اور سرفراز رفیقی شہید جیسے جانبازوں نے قومی تاریخ میں اپنے نام سنہرے حروف سے کندہ کرائے۔ اسکوارڈن لیڈر ایم۔ ایم عالم نے دشمن کے پانچ ہنٹر جہاز چند سیکنڈوں میں زمین بوس کر کے فضائی جنگ کی

تاریخ میں نیا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ دشمن کے ہوائی مستقروں پر کھڑے کھڑے جہازوں کو تباہ کردیا گیا اور یوں فضائی برتری بھی ثابت کردی گئی۔ فضا کے ان شاہینوں کو شاعر نے یوں خراج تحسین پیش کیا۔

یہ فضا کی شہریاری
یہ خلا پہ حکمرانی
تگ و تاز جاودانی
تب و تاب غیر فانی
یہ عقاب اونچا اونچا
یہ شباب پیارا پیارا
اسی شان سے اڑے جا
ستارا تا: ستارا

ہماری سمندری حدود کی پاسبان پاک بحریہ نے سمندری سرحدوں کا نہایت خوش اسلوبی سے دفاع کیا۔ اور دشمن کی دفاعی تنصیبات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ ۷ اور ۸ ستمبر کی نصف شب کو دوارکا کی مشہور بندرگاہ کو تباہ کردیا۔ یہ حملہ کموڈور ایس ایم نور کی زیر نگرانی ہوا۔ دوارکا کی بندرگاہ پر دشمن کے ہوائی حملے کی خبر دینے والا راڈار نصب تھا۔ نیز یہ بندرگاہ بھارتی فضائیہ کے لئے رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی تھی۔ اس طرح پاک افواج نے بری، بحری اور فضائی تینوں میدانوں میں بھارتی عزائم کو خاک میں ملادیا۔

اس جنگ میں ریڈیو پاکستان کا کردار ناقابل فراموش ہے جس نے پروپیگنڈے کے محاذ پر بہترین صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ شاعروں کے لکھے ہوئے اور گلوکاروں کے گائے قومی نغموں کو ریڈیو نے ملک کے گلی کوچے میں عام کردیا۔ ریڈیو کے نیوز ریڈر شکیل احمد کو بھارت کا دشمن نمبر تین قرار دیا گیا۔ کیونکہ وہ جنگی خبریں اتنے ولولہ انگیز طریقے سے پڑھتے تھے کہ سننے والوں کا لہو گرم ہوجاتا تھا۔

۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو اقوام متحدہ کی قرارداد کے ذریعے جنگ بندی عمل میں آئی۔ اگرچہ جنگ ستمبر کو جیتے تیس برس سے زائد ہوچکے ہیں مگر پاکستانی قوم ان شیر دل جوانوں کو یاد رکھے ہوئے ہے جنہوں نے مادرِ وطن کی خاطر سر اور دھڑ کی بازی لگادی۔ اور اس تاریخ کو اپنے لہو اور پسینے سے رقم کیا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے وطن کو مزید استحکام اور سلامتی عطا فرمائے۔ (آمین)

معذرت

اگست ۹۵ء کے شمارے میں رنگین صفحہ بعنوان "چڑیا گھر میں شیر بھی چڑیا" غلط جگہ شائع ہوگیا تھا۔ اس سہو پر ادارہ معذرت خواہ ہے۔ (ادارہ)

نہ وقت کی بازیاں نہ انتظار کی زحمت
پاکستان میں روزانہ ۱۸۲ پروازوں کی سہولت

ان میں ہماری روزانہ ۴۷ بین الاقوامی پروازیں بھی شامل کیجئے تو ہم ہی آپ کو روزانہ دوسروں سے کہیں زیادہ مقامات تک پروازیں فراہم کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہمارے اندرون ملک دائرۂ پرواز کا مقابلہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ مثلاً صرف کراچی اور لاہور کے درمیان ہم روزانہ تقریباً سات پروازیں پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ملک میں دیگر مقامات تک رسائی کے لئے ہم آپ کی سہولت کے مطابق پروقت تیار ہیں۔ پروازوں کا وسیع ترین دائرۂ کار ہمارے ساتھ سفر کا ایک اور جواز۔

PIA
پاکستان انٹرنیشنل

جھکے ہوئے شانے

شازیہ فرحین

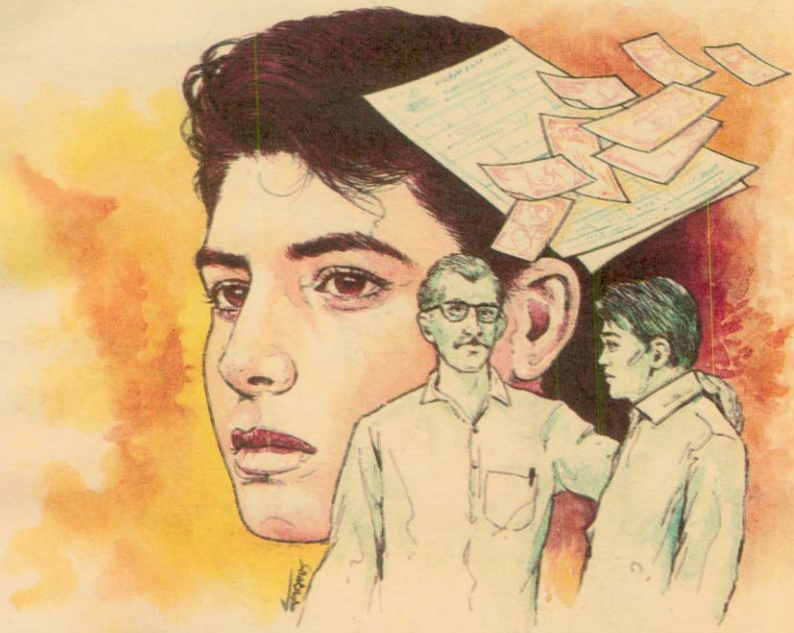

"دو ہزار آٹھ سو دس۔" ابا جان نے بجلی کے بل پر نظر ڈالتے ہوئے حیرانی سے کہا اور اردگرد نگاہ ڈالی۔عزیر کے کمرے کا پنکھا مع ٹیوب لائٹ اور فینسی لائٹ بدستور جل رہا تھا جبکہ وہ خود ڈائنگ ٹیبل پر بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ نائیلہ فون کا ریسیور ہاتھ میں لئے پچھلے آدھے گھنٹے سے اپنی کسی سہیلی سے محوِ گفتگو تھی۔

"حد ہوتی ہے فضول خرچی کی بھی۔" امی کو قریب آتا دیکھ کر ابا جان کی آواز بلند ہو گئی "یہ بل دیکھا ہے؟" ابا جان نے بل میں لکھی گئی رقم پر انگلی رکھ کر امی کو متوجہ کیا اور غراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔

ابا جان کو فضول خرچی سخت ناپسند تھی۔وہ ہمیشہ سے ہی گھر والوں کو کفایت شعاری کا درس دیتے آئے تھے مگر بھلا ہو سب کا، امی سے لے کر چھوٹی منی تک، سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے

اور ان میں سب سے زیادہ لاپروا عزیر تھا۔اس کے تمام خرچے شاہانہ تھے۔روز اسکول دس بارہ روپے لے جانا' اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کے کپڑے زیب تن کرنا' دوستوں کے ساتھ ویڈیو گیم کھیلنا' اکثر وی سی آر کی کیسٹس لے آنا یہ اور اس طرح کے کئی شوق اسے دل پسند تھے جبکہ ابا جان اس کی ان عادتوں سے سخت خائف تھے۔

شام کو جب ابا جان کا غصہ تھوڑا بہت ٹھنڈا ہوا تو حنا نے ان کے آگے گرما گرم چائے رکھ دی۔

"اس قدر غصہ بھی کچھ اچھا نہیں۔" امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں اپنی اولاد کی شاہ خرچیوں کی حوصلہ افزائی تم نہیں کروگی تو اور کون کرے گا۔" ابا جان بپھرتے ہوئے بولے۔

"انتہا ہوتی ہے ہر چیز کی بھی!" انہوں نے غٹاغٹ چائے پی اور پھر دفتر کا کام کرنے میں مگن ہوگئے۔وہ اکثر ہی دفتر کا ڈھیروں کام گھر لے آتے اور رات گئے تک اسے نمٹانے میں مصروف رہتے۔

اگلے روز ٹیلیفون کا بل بھی آگیا جو ابا جان کے ہاتھ میں دے کر نائلہ غڑپ سے اندر اپنے کمرے میں گھس گئی۔

"دو ہزار تین سو' ماشاء اللہ! یعنی ترقی پر ترقی۔" ابا جان زچ ہوگئے تھے کیونکہ اس ہوش ربا مہنگائی سے پہلے ہی وہ کچھ کم پریشان نہ تھے۔ اوپر سے یہ اخراجات!!

"آج سے فون پر تو تالا لگے گا۔" ابا جان نے حتمی انداز میں کہا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔عزیر اپنے کمرے میں بیٹھا ابا جان کی چیخ وپکار سن رہا تھا۔

"میاں اب تم بھی سدھر جاؤ۔" یکایک ہی عزیر کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے انہوں نے فینسی لائٹ بند کی اور اسے تنبیہہ کے انداز میں کہا۔وہ منہ بناتا ہوں تکیے میں منہ دیئے لیٹا رہا۔ابا جان نے ایک نظر اس کی رائٹنگ ٹیبل پر ڈالی دو تین موٹے موٹے جاسوسی ناول نصابی کتابوں کے درمیان رکھے تھے۔

"کیا کرایہ ہے ان ناولوں کا؟" انہوں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تین روپے۔"

"یہ شغل کب سے جاری ہے؟" انہوں نے اسے بستر پر دراز دیکھ کر کہا۔

"آج ہی لایا تھا!" عزیر اٹھ کر بیٹھا اور نظریں نیچی کیے ہوئے دھیرے سے جواب دیا۔

"بیٹے یہ فضول شوق کچھ اچھا نہیں ہے۔ابھی سے فضول خرچی کی عادتیں اپناؤ گے تو بڑے ہو کر

بہت پچھتانا پڑے گا۔ہمارا دین فضول خرچی سے بچنے کی تاکید کرتا ہے۔۔۔" ابا جان اب دھیمے لہجے میں اسے سمجھا رہے تھے اور وہ ایک کان سے سنتے ہوئے دوسرے کان سے ان کی بات اڑاتا ہوا ان کے جانے کا منتظر تھا۔

کچھ دیر بعد وہ گئے تو دوبارہ اس نے فینسی لائٹ بھی جلادی اور دروازہ بند کر کے جاسوسی ناول پڑھنے میں گم ہو گیا۔

☆------☆

"امی امی ذرا میری بات سنیں۔" امی کو حنا اور نائلہ کے ساتھ کچن میں دیکھ کر عزیر نے کہا۔

"کیا بات ہے ابھی آتی ہوں' ذرا میں کوفتے سالن میں ڈال دوں۔" امی نے ساڑھی کا پلّو کاندھے پر جمایا اور چولہے کی آنچ دھیمی کر دی۔

"یقیناً" کوئی فرمائش ہو گی" نائلہ نے قیاس ظاہر کیا۔

"ظاہر ہے، محترم نوابزادے جو ٹھہرے۔" حنا نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

"امی آپ کے نرم رویّے نے ہی عزیر کو بگاڑ دیا ہے' اسے ذرا بھی ابا جان کا خیال نہیں۔" حنا نے کہا۔

"اچھا اچھا اب تم زیادہ باتیں نہ بناؤ' خود کو ابا جان کا بڑا خیال ہے' روز نئی ڈشیں بنا کر جو پیسہ ضائع کرتی ہو اس پر کبھی توجہ کی اور تو اور ٹیلی فون تو گویا تمہارے لئے کھلونا ہے۔ہر وقت سہیلیوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف رہتی ہو۔"

عزیر نے زچ ہو کر کہا۔"بہرحال تم سے تو کم خرچہ ہے میرا۔" حنا نے ڈٹ کر کہا اور اس سے پہلے کہ بات بڑھتی امی اس کے پاس چلی آئیں۔

"امی آپ کو پتہ ہے نائلہ کے بھائی کا اگلے ہفتے ولیمہ ہے۔ہم سب دوست اپنے اپنے کپڑے خریدنے طارق روڈ جا رہے ہیں۔آپ مجھے صرف پانچ' چھ سو روپے دے دیجئے۔

"بیٹے کپڑے تو تمہارے پاس پہلے بھی اتنے رکھے ہیں۔"

"لیکن وہ نئے نہیں ہیں۔بس مجھے چاہئیں آپ ابا جان سے کہیں وہ دے دیں گے۔"

"تم خود کیوں نہیں کہتے؟" امی نے جرح کی۔

"انہیں تو مجھ سے اللہ واسطے کا بیر رہتا ہے۔ان کا بس چلے تو مجھے آزاد فضا میں سانس بھی نہ لینے دیں۔"

"زیادہ بڑھئے نہ ضرورت نہیں' پوچھ کر دیکھتی ہوں۔" امی یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں آئیں جہاں ابا جان کام میں مصروف تھے۔

"عزیر کو پانچ چھ سو کی ضرورت ہے' نیا سوٹ خریدنا ہے۔"

"کس سلسلے میں؟ کیا پہلے ہی بہت سے کپڑے موجود نہیں ہیں؟" ابا جان نے برہم ہو کر کہا۔

"کہہ رہا ہے طٰہٰ کے بھائی کی شادی میں پہننا ہے۔"

"کہہ دو اس مہینے گنجائش بالکل نہیں ہے۔" ابا جان نے سر اٹھا کر کہا اور امی نے یہی جملہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

"آپ لوگوں نے کبھی میری خواہش کا احترام نہیں کیا۔" عزیر کے لہجے میں مایوسی تھی اور وہ پیر پٹختا ہوا باہر کی جانب جا رہا تھا۔

☆-------☆

"ابا جان وہ مجھے آپ جو ہر ماہ خرچہ دیتے ہیں اس میں کچھ اضافہ کر دیں پورا نہیں پڑتا۔" عزیر نے ناشتہ کرتے ہوئے ابا جان سے کہا۔

"بیٹا پہلے ہی گھر میں سب سے زیادہ خرچہ تمہیں ملتا ہے اور اب اس پر بھی تم خوش نہیں۔" ابا جان نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"خیر کوشش کروں گا۔" ابا جان کا لہجہ شکستہ تھا کیونکہ اب اس کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جاتا تو ممکن تھا وہ کوئی اور طریقہ استعمال کرتا اسی لئے انہوں نے بحث کے بجائے مصالحت کا رویہ اختیار کیا۔

☆------☆

ان دنوں اسکول کی طرف سے پاکستان ٹور کا پروگرام بن رہا تھا اور ابا جان کے پاس قطعاً اتنی گنجائش نہ تھی کہ وہ یہ خرچہ برداشت کرتے ان کے صاف لفظوں میں منع کرنے پر اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔

ابا جان کو دل ہی دل میں کنجوس کا خطاب دیتا ہوا وہ اسکول پہنچا وہاں پر اسلم صاحب لڑکوں سے ٹور کے پیسے اکٹھے کر رہے تھے اور وہ اداسی سے کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک یونہی وہ سوچتا رہا اور پھر آخری کوشش کے طور پر واپسی میں ابا جان کے آفس چل دیا۔ ابا جان اپنی رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھے بے حد مصروف تھے اور ان کی انگلیاں کمپیوٹر کی مانند ٹائپ رائٹر کے حروفوں سے الجھ رہی تھیں۔ اسے آفس میں دیکھ کر وہ حیران ہوئے اور اس کا مدعا سن کر اسے کچھ دیر بیٹھنے کو کہا وہ سامنے ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد ڈائریکٹر صاحب باہر آئے اور ابا جان کی سیٹ پر ٹھہرتے ہوئے بولے "آپ کی ٹائپنگ اسپیڈ تو بڑی اچھی تھی یہ کیا ہو گیا اور غلطیاں بھی آج خوب تھیں"

"وہ جی اصل میں اب دکھائی صاف نہیں دیتا شاید اس لئے ---" ابا جان کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

"اوور ٹائم بھی تو آپ خوب کرتے ہیں، کچھ اپنی

صحت کا بھی خیال رکھیے۔" ڈائریکٹر صاحب یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور ابا جان کی انگلیاں مسلسل ٹائپ رائٹر پر متحرک رہیں۔

کچھ دیر بعد لنچ ٹائم ہوا تو سب اپنی سیٹوں سے اٹھ کر چل دیئے مگر ابا جان ہنوز وہاں بیٹھے رہے۔

"ابا جان آپ لنچ کرنے نہیں جا رہے؟" عزیر نے حیرانگی سے کہا۔

"بیٹا آج وقت نہیں ہے کام بہت سارا ہے نا۔" ابا جان کی بات سن کر وہ حیران ہوا اور پھر ابا جان کے کہنے پر وہ گھر کی طرف چل دیا۔

شام کو ویڈیو گیم کی دکان سے واپسی پر اس نے ابا جان کو قریبی کلینک سے نکلتے دیکھا تو وہ قریب چلا آیا۔

"کیا طبیعت خراب ہے آپ کی؟" عزیر نے پوچھا۔

"ہاں آنکھوں میں شاید موتیا ہو گیا ہے ڈاکٹر نے آپریشن کا کہا ہے۔" ابا جان کا متفکر لہجہ اسے بوجھل کر گیا۔

"پھر کیا تاریخ دی ڈاکٹر نے؟"

"بیٹا اس مہینے تو اخراجات اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ گنجائش نہیں، اگلے مہینے دیکھوں گا انشاء اللہ!" ابا جان نے سنجیدگی سے کہا اور عزیر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

رات کے کھانے پر اسے متفکر اور خاموش دیکھ کر ابا جان بول پڑے،

"صاحب زادے کیا ناراض ہیں ہم سے، بھئی انشاء اللہ آپ کو ٹور پر بھجوانے کا انتظام ہو جائے گا دو دن تک ذرا صبر کر لو۔" ابا جان کے کہنے پر وہ خاموش رہا کیونکہ وہ تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

رات کھانے کے بعد اس نے وی سی آر دیکھنے کا پروگرام ملتوی کر دیا اور خاموش اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

رات کو تین بجے اس کی آنکھ کھلی وہ پانی پینے باہر آیا اور ابا جان کے کمرے کی لائٹ کھلی دیکھ کر بڑبڑایا "ہنہ خود تو بجلی کے بے جا خرچ پر ٹوکتے رہتے ہیں اور لائٹ کھول کر سو گئے یہ سوچتا ہوا وہ آگے بڑھا اور انہیں کام کرتا دیکھ کر وہ حیران ہوتا ہوا اندر چل دیا۔

"ابا جان آپ کی آنکھوں میں تکلیف ہے پھر بھی اتنی رات گئے تک آپ کام کر رہے ہیں؟" اس کے لہجے میں ہلکا سا غصہ نمایاں تھا۔

"بیٹا یہ تو روز کا ہی معمول ہے یہ اور بات ہے کہ تم نے آج دیکھا ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسے اور پھر مصروف ہو گئے جب کہ وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہا اور پھر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

یونہی دو تین روز گزر گئے اور اس کی طبیعت میں بوجھل پن نمایاں رہا جسے سب نے ہی محسوس کیا ورنہ ہر روز اس کی نت نئی فرمائشیں سر اٹھاتی تھیں اور آج اسے خاموش دیکھ کر بالآخر نائلہ بول ہی پڑی۔

"کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔"

نائلہ کے پُر معنی سوال پر وہ خاموش تھا اور ابا جان سمجھ گئے تھے کہ یہ خاموشی پاکستان ٹور کے پیسے نہ ملنے کی وجہ سے ہے۔

"عزیر میں نے رقم کا انتظام کر لیا ہے آج اسکول لے جانا۔" ابا جان نے اخبار سے سر اٹھاتے ہوئے کہا اور چائے کی پیالی اپنی طرف سرکائی۔

"لیکن ابا جان اب میرا جانے کا ارادہ نہیں ہے۔" عزیر گہری سوچ میں گم دھیرے سے بول رہا تھا

"کیوں؟" ابا جان کے لہجے میں ہزاروں سوال تھے۔

"بس اب مجھ سے آپ کی یہ سخت محنت نہیں دیکھی جاتی" یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے اپنا بستہ لئے باہر نکل گیا اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور ابا جان کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ان کے جھکے ہوئے شانے ایک دم توانا ہو گئے ہیں!

دل و دماغ کی اضافی قوت
کے لئے مُربّہ سیب چاندی کے
ورق میں لپیٹ کر کھائیے

احمد کا

مُربّہ سیب

انتہائی مقوی

۶ ستمبر

افشاں بشیر

یہ وعدہ ہے ہمیشہ چھ ستمبر یاد رکھیں گے
شہیدوں کے لہو کا حق ہے ہم پر یاد رکھیں گے

ہمیں دشمن نے جو دھوکہ دیا تھا یاد ہے ہم کو
جو بے خبری میں اک حملا کیا تھا یاد ہے ہم کو
جوابِ دشمناں پھر کیا دیا تھا، یاد ہے ہم کو
شکست اپنی عدو ہم سے بھی بہتر یاد رکھیں گے
یہ وعدہ ہے ہمیشہ چھ ستمبر یاد رکھیں گے

وہ صبحِ جنگ گویا منظرِ روزِ قیامت تھا
شہیدوں کے لئے وہ ایک دن یومِ سعادت تھا
نہاں ہر ایک دل میں جذبۂ شوقِ شہادت تھا
کٹائے تھے وطن کی آن پر سر یاد رکھیں گے
یہ وعدہ ہے ہمیشہ چھ ستمبر یاد رکھیں گے

نہ بھولے گا کبھی دشمن کا وہ شیطان ہوجانا
جنونِ جنگ میں انسان سے حیوان ہوجانا
وہ سب اہلِ وطن کا مل کے پاکستان ہوجانا
بھگایا دشمنوں کا کیسے لشکر یاد رکھیں گے
یہ وعدہ ہے ہمیشہ چھ ستمبر یاد رکھیں گے

نظر آیا تھا ملکِ پاک پر قبضہ کا خواب اُن کو
دیا منہ توڑ حملے سے مگر ہم نے جواب اُن کو
قیامت تک نہ بھولے گا کبھی روزِ حساب اُن کو
وہ فوجِ پاک تھی اس دم غضنفر، یاد رکھیں گے
یہ وعدہ ہے ہمیشہ چھ ستمبر یاد رکھیں گے

جیالے شہریوں کو یاد ہے یومِ جہاد اب تک
کہانی سرفروشی کی نہیں بھولی، ہے یاد اب تک
خدا کے فضل سے اپنا وطن ہے زندہ باد اب تک
اسے زندہ رکھیں گے جان دے کر، یاد رکھیں گے
یہ وعدہ ہے ہمیشہ چھ ستمبر یاد رکھیں گے

اکبر الٰہ آبادی

ڈاکٹر اسلم فرخی

انگریز افسر لڑکے کو دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ چودہ پندرہ برس کا لڑکا۔ پوچھنے لگا "تم کام کر سکو گے؟" لڑکے نے کہا "جی ہاں"۔ اس افسر نے کچھ کاغذات لڑکے کے سامنے ڈال دیئے اور کہا "لکھو"۔ وہ لکھواتا رہا۔ لڑکا لکھتا رہا۔ لڑکے نے خود بھی بڑے اعتماد سے کچھ چیزیں لکھیں۔ افسر لڑکے کی لیاقت سے بڑا خوش ہوا اور اسے ملازم رکھ لیا۔ اس لڑکے کا نام تھا سید اکبر حسین اور یہ بات آج سے کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے کی ہے۔

سید اکبر حسین نے بڑی ترقی کی چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کرتے رہے۔ پھر وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔ وکالت کرنے لگے۔ جلد ہی انہیں منصف مقرر کر دیا گیا اور وہ ترقی کر کے جج اور پھر سیشن جج ہو گئے۔ انگریزی حکومت انہیں ہائی کورٹ کا جج بنانا چاہتی تھی مگر ان کی صحت خراب ہو گئی تھی اس وجہ سے انکار کر دیا اور پینشن لے لی۔ اکبر

حسین بڑے قابل جج تھے۔ بڑے بے لاگ فیصلے کرتے تھے۔ لیکن ان کی شہرت جج ہونے کی وجہ سے نہیں ہے۔ جج تو ہزاروں ہوتے ہیں۔ اکبر کی شہرت کی وجہ ان کی شاعری تھی ایسی شاعری جس کی سارے زمانے میں دھوم مچ گئی۔ آج سید اکبر حسین کو کوئی نہیں جانتا مگر اکبر الہ آبادی کو سب جانتے ہیں اور ان کے شعر پڑھ کر مزے لیتے ہیں۔

بچپن ہی سے اکبر کو شعروشاعری سے دل چسپی تھی۔ شعر کہنے لگے۔ اس زمانے کے دوسرے شاعر جس طرح کی غزلیں لکھتے تھے اسی طرح کی غزلیں لکھتے رہے۔ ایک بزرگ استاد تھے وحید الہ آبادی، ان کے شاگرد ہوگئے۔ مگر جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ عام انداز کی غزلیں لکھنے سے کوئی ترقی نہیں کرسکتے نہ یہ ان کا مزاج ہے۔ وہ اپنی قوم کی بھلائی چاہتے تھے اور اپنی شاعری کو بھی اسی مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ یہ کام دو طرح سے ہوسکتا تھا۔ ایک تو یہ کہ سیدھے سادے شعر لکھے جائیں۔ ایسے سادہ شعر جن میں قومی بھلائی کی باتیں ہوں۔ لوگ انہیں پڑھیں اور ان سے سبق حاصل کریں۔ اس زمانے میں خواجہ الطاف حسین حالی اور بعض دوسرے شاعر ایسے ہی شعر اور نظمیں لکھ رہے تھے۔ پڑھنے والے انہیں پسند بھی کرتے تھے۔ مگر بات یہ ہے کہ جب کوئی قوم غفلت کی نیند میں ڈوبی ہوئی ہو تو اس پر سیدھی سادی باتوں کا اثر بہت دیر میں ہوتا ہے اور کم ہوتا ہے۔

اکبر یہ دیکھ رہے تھے کہ برصغیر کے مسلمانوں کی حالت روز بروز خراب ہوتی جارہی ہے۔ ترقی کے میدان میں سب سے پیچھے ہیں۔ دماغوں میں یہ خیال بسا ہوا ہے کہ ہم اس ملک میں بادشاہ تھے۔ ہمارا کام بادشاہت ہے وہ ہمیں خود بخود مل جائے گی۔ یہ سوچ بالکل غلط تھی۔ پھر انگریزی حکومت بہت سخت تھی۔ مسلمانوں کو پسند نہیں کرتی تھی۔ مسلمان بھی عام طور پر اس سے دور دور ہی رہتے تھے۔ برصغیر کی دوسری قومیں انگریزی تعلیم حاصل کررہی تھیں۔ نئے نئے علوم پڑھ رہی تھیں۔ مغربی ملکوں کے نئے خیالات اور ایجادوں سے فائدہ اٹھارہی تھیں۔ مگر مسلمانوں کو ان سب سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اس زمانے کے ایک باہمت مسلمان سید احمد نے مسلمانوں کی تعلیم اور ترقی کے لئے علی گڑھ میں ایک کالج کھولا تھا مگر عام مسلمان اسے بھی بُرا سمجھتے تھے۔ کیونکہ بعض لوگوں نے انگریزی پڑھ کر روزمرہ زندگی میں انگریزوں کی بھونڈی نقل شروع کردی۔ اپنے طور طریقے بھول گئے، دین ایمان چھوڑ دیا اور کالے صاحب بن گئے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اکبر نے سوچا کہ

سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلتا۔ سیدھی سادی باتوں سے قوم پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔اس وجہ سے انہوں ہنسنے ہنسانے' مذاق اڑانے' چٹکیاں لینے' گدگدی کرنے اور سیدھی سادی باتوں کو مزاح کے انداز میں کہنا شروع کیا۔

شیطان ہے دل جو نور ایماں نہ رہے
دشمن ہے زباں جو ورد قرآں نہ رہے
کہتی ہے یہ ہسٹری بہ آواز بلند
تم کچھ نہ رہے اگر مسلماں نہ رہے
چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
قوم و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی' کلرکی کر' خوشی سے پھول جا

یہ شعر نہیں ہیں' چٹکیاں ہیں پڑھنے والا تڑپ جاتا ہے۔ کیسی سچی بات کہی ہے اور کس انداز سے کہی ہے کہ دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو قوم کی حالت پر بہت رنج ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ غفلت کے طریقے چھوڑے دیے جائیں اسی وجہ سے وہ چٹکیاں لے لے کر ہوشیار کر رہا ہے۔ اکبر کے زمانے میں اٹلی نے ترکی سلطنت کے ایک حصہ پر حملہ کر دیا تھا برصغیر کے مسلمان بے بس تھے۔ ترکی کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے جو خود دوسروں کی مدد کے محتاج ہوں وہ کسی اور کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔ اکبر نے یہ بات ہنسی کے انداز میں اس طرح کہی ہے۔

نہ لیسنس ہتھیار کا ہے نہ زور
کہ ترکی کے دشمن سے جا کر لڑیں
تہ دل سے ہم کوستے ہیں مگر
کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

کچھ کر تو سکتے نہیں بس بد دعا کر سکتے ہیں۔ اکبر کی شاعری میں اس طرح کی ہزاروں پھلجڑیاں ہیں۔ بظاہر ہنسنے ہنسانے کی باتیں لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعر نے ہنسی ہنسی میں دل نوچ لیا ہے۔ وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جس سے قومی غیرت جاگتی ہے اور اپنی خراب حالت کا احساس ہوتا ہے۔

اکبر کے عہد میں انگریزی تہذیب بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ اس کے اثر سے مسلمان اپنی تہذیب سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر مسلمان نوجوان اللہ' رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دین مذہب کو بھلا بیٹھا تو پھر اس کا کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا۔ وہ نئی تعلیم اور تہذیب کے خلاف نہیں تھے۔ اس کے خراب اثر سے نوجوانوں کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو
لازم ہے غباروں پہ چڑھو چرخ پہ جھولو
لیکن یہ سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

انگریزی تہذیب کے حوالے سے اکبر نے بڑے خوبصورت شعر لکھے ہیں۔

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے
پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی
کیک کو چکھ کے سویوں کا مزا بھول گئے
قومی رہ نمائی کا دعویٰ کرنے والے جس آرام سے زندگی گزارتے ہیں اس کا نقشہ بھی دیکھیں۔
قوم کے غم میں ڈنر کھاتا ہے حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

یہ بات آج بھی بالکل سچی ہے جو حال اکبر کے زمانے میں تھا وہی آج بھی ہے۔

اکبر بڑے شاعر تھے۔ زبردست شاعر تھے اردو میں انگریزی الفاظ اس سلیقے سے استعمال کرتے تھے کہ شعر کا اثر بڑھ جاتا تھا۔

زندگی اور قیامت میں ریلیشن[1] سمجھو
اسے کالج اور اسے کانووکیشن[2] سمجھو

ان کے بہت سے شعر انگریزی لفظوں کی وجہ سے بڑے خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔ بعض نظمیں ایسی خوبصورت ہیں اور ان میں شاعری کا ایسا کمال ہے کہ تعجب معلوم ہوتا ہے۔ ایک نظم میں پانی کے بڑھنے کا منظر دکھایا ہے؟ "غرض دیکھئے اب یہ پانی چلا" اس میں پانی کے بڑھنے کا جو نقشہ ہے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں' ان سے واقعی محسوس ہوتا ہے کہ پانی بڑھتا چلا آرہا ہے۔ ایک نظم تیتریوں کے اڑنے کا سماں ہے۔ نظم پڑھنے میں دو خوبصورت تیتریاں فضا میں اڑتی محسوس ہوتی ہیں۔ اکبر موقع کی مناسبت سے فوراً شعر کہتے تھے اور ایسا شعر کہتے تھے کہ سننے والے حیران رہ جاتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ جرمنی اور برطانیہ کا مقابلہ تھا۔ انگریزوں کی غلامی کی وجہ سے برصغیر کے لوگوں کی ہمدردیاں جرمنی کے ساتھ تھیں۔ مگر کوئی کھل کر کچھ نہیں کر سکتا تھا انگریزی حکومت کا خوف تھا۔ ایک دن اکبر انگریز افسر سے ملنے گئے۔ یہ افسر چیف سیکریٹری تھا اور اردو بہت اچھی جانتا تھا۔ وہ اکبر سے کہنے لگا۔ سید صاحب آپ نے انگریزوں کی حمایت میں کچھ نہیں کہا۔ اکبر نے کہا' کہا تو کچھ نہیں لیکن ابھی ہوا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر مصرع پڑھا۔ "ہم اس کے ساتھ ہیں کہ خدا جس کے ساتھ ہے۔" انگریز بڑا خوش ہوا کہ اکبر نے خدا کو انگریزوں کا ساتھی قرار دے دیا مگر جب اکبر نے دوسرا مصرع پڑھا' انگریز کی ساری خوشی خاک میں مل گئی۔ انہوں نے بے دھڑک پڑھا'

ہم اسکے ساتھ ہیں خدا جس کے ساتھ ہے
لیکن خبر نہیں کہ خدا کس کے ساتھ ہے

یہ بڑی ہمت کی بات تھی مگر اکبر بڑی ہمت والے شاعر تھے۔ ایسی دہری بات کہتے تھے کہ کوئی قانونی

[1] (Relation) [2] (Convocation)

پکڑ نہیں ہو سکتی تھی۔

اکبر بڑے دین دار انسان تھے۔ ان کی بڑی عزت تھی انہیں "لسان العصر" وقت کی زبان کہا جاتا تھا۔ علامہ اقبالؒ اکبرؔ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کی شاعری کو پسند کرتے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے اکبر کے ہنسنے ہنسانے والے انداز میں خود بھی شعر کہے ہیں۔ یہ شعر علامہ کے پہلے اردو مجموعے "بانگ درا" میں شامل ہیں مگر علامہ اقبال نے یہ انداز اکبرؔ کے لئے چھوڑ دیا۔ انگریزی حکومت نے بھی اکبر کو خان بہادر کا خطاب دیا تھا۔ دور دور سے لوگ اکبر سے ملنے اور ان کے خیالات سننے آتے تھے۔ الہ آباد کو ان کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔ کیسے خوبصورت انداز سے اکبر نے یہ بات کہی ہے۔

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

قوم کا یہ ہمدرد اور ساری دنیا کو ہنسانے والا ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو یعنی آج سے چوہتر برس پہلے اللہ تعالیٰ سے جا ملا۔ لیکن اس کے شعر آج بھی دلوں کو گدگداتے ہیں اور قومی غیرت کو للکارتے ہیں۔

شعرِ اکبرؔ کو سمجھ لو یادگار انقلاب
یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

کامیابی مبارک
اپنی کامیابی سے
ہمیں بھی باخبر کیجئے
آپ کسی بھی کلاس کے طالب علم ہوں ... اگر آپ نے کلاس میں
پہلی پوزیشن
دوسری پوزیشن
یا
تیسری پوزیشن
حاصل کی ہے تو اس کی تصدیق اپنے تعلیمی ادارے کے سربراہ سے کروائیے اور ہمیں بھجوا دیجئے!
ہم آپ کو
پرائڈ آف پوزیشن
کی سند دیں گے
تحریکِ فروغِ علم میں پیش پیش
ماہنامہ
آنکھ مچولی
1- پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

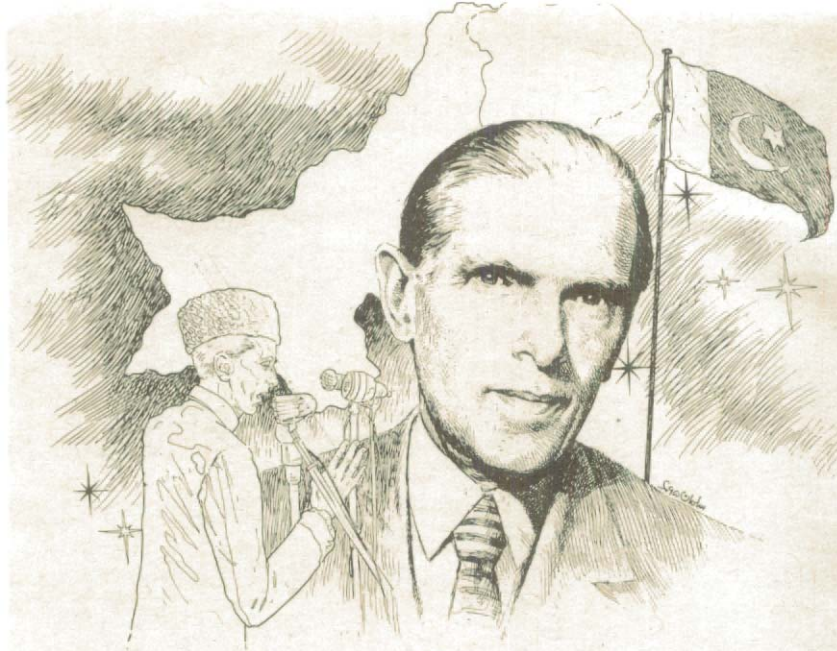

قائد
موت کے دروازے پر

محمد جاوید خالد

کمرے میں موجود مسہری پر ایک شخص لیٹا ہوا تھا، بیمار اور کمزور۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور گال اندر کی طرف دھنس گئے تھے۔ اس کا کھلتا ہوا رنگ بیماری کی وجہ سے اور زیادہ نکھر گیا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور ان میں سفیدی، چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ چہرے پہ جھریاں تھیں مگر یہ جھریاں کسی شاعر یا فلسفی کی طرح اس کے گہرے مطالعے اور غور و فکر کی باریکیوں کو نمایاں کررہی تھیں۔ ان سب کے باوجود اس کا چہرہ باوقار اور پُر جلال تھا۔ آنکھوں میں بلا کی چمک تھی اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ۔

نرس نے تھرمامیٹر سے ٹمپریچر نوٹ کیا تو اس شخص کی گونجتی ہوئی آواز نے کمرے کے سکوت کو درہم برہم کردیا۔

"میرا ٹمپریچر کتنا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"سر! یہ میں صرف ڈاکٹر کو بتا سکتی ہوں۔" نرس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا

"مگر میں اپنا ٹمپریچر معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" مریض نے اصرار کیا۔

نرس ایک لمحے کو ہچکچائی کیونکہ یہ اصرار کسی معمولی آدمی کا اصرار نہیں تھا۔ یہ ملک کا بہت بڑا بلکہ سب سے بڑا آدمی تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مؤقف پر ڈٹی رہی۔ "سوری سر! یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔" اس نے کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

کمرے میں مریض کی بہن بھی موجود تھی۔ وہ مسکرایا اور اپنی بہن کی طرف رخ کر کے بولا۔ "میں اس قسم کے لوگوں کو پسند کرتا ہوں ..... لوگ جو مصمم ارادے کے مالک ہوں اور جو خوف زدہ ہونے سے صاف انکار کردیں۔"

بستر مرض پر لیٹے ہوئے یہ مریض بانیٔ پاکستان، بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ جن کی زندگی کا ہر لمحہ اور پہلو اصولوں کی پاسداری میں گزرا۔ یہ بسترِ مرض بعد میں بسترِ مرگ ثابت ہوا لیکن اس حالت میں بھی وہ اصولوں کو دیوانہ وار چاہتے تھے اور جہاں اصولوں کی پاسداری دیکھتے، اسے سراہتے تھے۔

پاکستان کی پہلی سالگرہ پر اپنی قوم کے نام پیغام میں انہوں نے کہا تھا "یاد رکھئے پاکستان کا قیام ایک ایسی حقیقت ہے جس کی دنیا کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی ....." تاریخ دنیا کی یہ منفرد مثال قائم کرنے میں قائداعظم نے کسی چیز کی پروا نہیں کی۔ نہ اپنے آرام کی، نہ غذا کی، نہ دوا کی، نہ صحت کی۔ بس ایک مقصد تھا اور اس مقصد کی خاطر انہوں نے دن رات ایک کیا ہوا تھا اور جب یہ مقصد پورا ہو گیا تو بلاشبہ وہ بہت تھک چکے تھے۔ ان کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے۔ کمزوری نے انہیں ہڈیوں کا ایک پنجر بنا دیا تھا جس میں اک بے تاب دل کچھ کرنے کے لئے مسلسل بے چین رہتا تھا۔

پاکستان بننے کے بعد قائداعظم کو زندگی کی مہلت بہت کم ملی تھی۔ صرف ایک سال اور چھبیس دن۔ یہ مختصر عرصہ بھی ایسا جس میں بیماری اور کمزوری اپنے عروج پر تھی۔ لیکن یہ بات بڑی عبرت انگیز ہے کہ اس ملک کے بڑے سے بڑے لیڈر نے زیادہ سے زیادہ عرصے میں بھی اس کے لئے اتنا کام نہیں کیا جتنا قائداعظم نے اتنی مختصر سی مہلت میں کیا۔ نئی مملکت کے نئے نئے مسائل تھے اور سب سنگین۔ نئی مملکت کی داخلہ اور خارجہ پالیسیاں، درپیش مسائل کی نشان دہی، ان کے حل کے لئے انتھک کام، مہاجرین کی رہائش و خوراک کی منصوبہ بندی، ان میں وطن سے وابستگی کے جذبہ کا فروغ، اقلیتوں کی حفاظت، صوبوں کا دورہ، صوبوں میں وطنیت کا احساس، مسئلہ کشمیر، سیاستدانوں سے ملاقاتیں، اجلاسوں کی صدارت، انتظامیہ کا مؤثر نظام، افواج کی تنظیمِ نو غرض کہ کاموں کی ایک طویل قطار تھی جن کا

سامنا قائد کو کرنا پڑ رہا تھا اور اپنی ساری ناتوانیوں کے باوجود ان کاموں کو نپٹانے کے لئے وہ "جن" بنے ہوئے تھے۔ ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح اپنے بھائی کو پیار سے "جن" ہی کہا کرتی تھیں۔ یہ غالباً جناح کا مخفف رہا ہو گا۔

قائد کے آخری دنوں میں ان کے ڈاکٹر، ان کے مخلص، آرام کے لئے بار بار اصرار کرتے رہے لیکن یہ اصرار وہ ہمیشہ مسکرا کر ٹال دیتے تھے یا ایسا جواب دیتے تھے کہ مقابل کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہ جاتا تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے کہا۔ "کیا تم نے کبھی سنا ہے کہ کسی جنرل نے چھٹی کی ہو جب اس کی فوج میدان جنگ میں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہو۔" ایک اور مرحلے پر انہوں نے کہا۔ "میں اپنی جسمانی طاقت کی کان کھود کر توانائی کا آخری اونس تک ڈھونڈ نکالوں گا اور اسے اپنی قوم کی خدمت میں صرف کردوں گا۔"

اپنی ناتوانی اور تنگیٔ وقت کا احساس خود قائد اعظم کو بھی تھا۔ وہ عمر عزیز کے "اکہتر" سال گزار چکے تھے اور وہ بھی مسلسل جدوجہد میں۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یونیورسٹی اسٹیڈیم لاہور میں حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے پہلی بار موت کا تذکرہ کیا لیکن اس تذکرے میں بھی ایک آن بان تھی، ایک وقار تھا۔ انہوں نے کہا۔

"اس جدوجہد کے ساتھ ساتھ اپنا حوصلہ برقرار رکھئے۔ موت سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں پاکستان اور اسلام کے وقار کے تحفظ کی خاطر موت کو جرأت کے ساتھ گلے لگانا چاہئے..... اپنا فرض ادا کرتے رہئے اور خدا پر مکمل بھروسہ رکھئے۔ روئے زمین پر کوئی ایسی طاقت نہیں جو پاکستان کو ختم کر سکے یہ ہمیشہ قائم رہنے کے لئے بنا ہے۔"

۱۹ مارچ ۱۹۴۸ء کو اسی ناتوانی و کمزوری کے عالم میں آپ نے مشرقی پاکستان کا تاریخ ساز دورہ کیا جہاں ہندو بنگالی زبان کو مسئلہ بنا کر تعصب کی آگ کو ہوا دے رہے تھے۔ اپنی گرتی ہوئی صحت کی پروا کئے بغیر وہ ایک ماہ تک مختلف علاقوں کا دورہ کر کے "پاکستانیت" کو فروغ دیتے رہے۔ مئی کے آخر میں ڈاکٹروں نے تجویز کیا کہ آب و ہوا کی تبدیلی اور کام کے بوجھ کو کم کرنے کے لئے قائد اعظم کو "کوئٹہ" چلے جانا چاہئے۔ کوئٹہ میں آب و ہوا تو تبدیل ہو گئی مگر ان کی مصروفیتوں میں کوئی فرق نہ پڑا۔ تقریبیں تھیں۔ تقریریں تھیں اور پاکستان کا مضبوط مستقبل ان کا موضوع تھا۔ یکم جولائی کو کراچی میں اسٹیٹ بینک کا انہیں افتتاح کرنا تھا۔ ڈاکٹروں نے انہیں سفر اور تقریر سے منع کیا مگر قائد اعظم کا کہنا تھا کہ "یہ ہماری اقتصادی اور معاشی خوش حالی کا سوال ہے۔ میں

ضرور جاؤں گا۔انہوں نے پروگرام کے مطابق اسٹیٹ بینک کا افتتاح کیا۔تقریر بھی کی مگر اس عالم میں کہ ان کی آواز بمشکل نکل رہی تھی اور وہ رک رک کر' کھانس کھانس کر تقریر کررہے تھے۔ ۷ جولائی کو انہیں پھر کوئٹہ لے جایا گیا۔ ۲۱ جولائی کو طبیعت سنبھلتی نہ دیکھ کر لاہور کے نامور فزیشن ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش کو کوئٹہ بلوالیا گیا۔ معائنہ کے بعد معلوم ہوا کہ قائد کے پھیپھڑوں میں انفیکشن ہے اور انہیں ٹی۔بی ہو چکی ہے۔

مکمل آرام ان کی صحت کا تقاضا تھا مگر یہ تقاضا انہوں نے کبھی پورا نہیں کیا۔ اسی عالم میں پاکستان کی پہلی سالگرہ آئی اور انہوں نے قوم کے نام پیغام خود تیار کر کے جاری کیا۔ ۲۷ اگست کو عیدالفطر تھی۔ اس موقعہ پر ان کا پیغام ان کی آخری تقریر ثابت ہوئی۔ قائداعظم کے آخری ریکارڈ شدہ الفاظ تھے..... "صرف مشترکہ کوششوں اور مقدر پر یقین کے ساتھ ہی ہم اپنے خوابوں کے پاکستان کو حقیقت کا روپ دے سکتے ہیں۔ میرے پیغام کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر پاکستانی کو دیانت داری' خلوص اور بے غرضی سے پاکستان کی خدمت کرنی چاہئے۔"

یکم ستمبر کو ان پر بیماری کا حملہ ہوا اور پانچ ستمبر کی شام کو انہیں نمونیہ ہوگیا۔ دس ستمبر کو ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش نے محترمہ فاطمہ جناح کو یہ دہشت ناک اطلاع دی کہ قائداعظم اب چند دنوں کے مہمان ہیں۔ ۱۱ ستمبر کو انہیں کراچی لایا گیا۔ رات کے تقریباً" ساڑھے نو بجے ان کی طبیعت اچانک شدید بگڑ گئی۔ چوٹی کے ڈاکٹر اپنی بھرپور کوشش کرتے رہے لیکن دس بج کر پچیس منٹ پر وہ دل ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا جس میں قوم کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ بابائے قوم چل بسے اور مسائل میں گھری ہوئی قوم یتیم ہوگئی۔

یہ خبر پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ روتے ہوئے لوگوں اور بین کرتی عورتوں کا ایک سیلاب تھا جو گورنر ہاؤس کی طرف امڈ رہا تھا جہاں ان کے قائد کا جسد خاکی دیدار کے لئے موجود تھا۔ اسی رات بولٹن مارکیٹ کراچی کے قریب ایک ہجوم کو ایک غم زدہ شخص نے آکر یہ اطلاع دی کہ "قائداعظم کا انتقال ہوگیا۔" لوگ جیسے سکتے میں رہ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے مزید تفصیل پوچھتے' ایک شخص نے آگے بڑھ کے اجنبی کے چہرے پر زوردار طمانچہ رسید کیا اور کہا "کیا کہتا ہے"؟ لمحہ بھر کو وہ اجنبی حیران رہ گیا پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے طمانچہ مارنے والے کی جانب.... اپنا دوسرا گال بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بھائی اس پر بھی طمانچہ مارلو اور مجھے یقین دلادو کہ قائداعظم زندہ ہیں۔"

واقعی سہولت تو حبیب بناسپتی کی ہے

صارفین کی سہولت کے لئے آسانی سے کھلنے اور بند ہونے والا ڈھکنا اور اس کے نیچے نرم فوائل کی سیل جس کی بدولت حبیب بناسپتی کی اعلیٰ کوالٹی اور تازگی آخر تک برقرار۔

بہتر تو تھا ہی اب سب سے بہترین

تم آشنا

محمد مجاہد منہاس

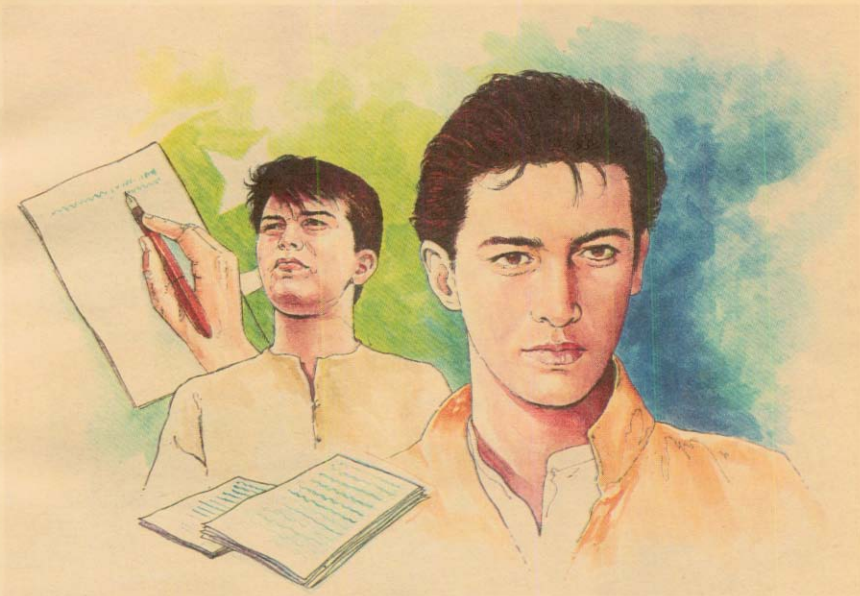

"۱۹۹۴ء کا بہترین رائٹر عمر رضا...." یہ وہ فقرہ تھا جو میں نے یونیورسٹی کے آڈی ٹوریم میں سنا تھا۔ اور اب یہ بار بار میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ میں نے اس سے اپنا موازنہ کیا۔ "کیا میں اس سے کم ہوں۔ میری کہانیاں تو اس سے کہیں زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔ جاسوسی' مار دھاڑ' سسپنس' ایڈونچر... کیا کچھ نہیں ہوتا میری کہانیوں میں۔"

میری اور اس کی ملاقات نوجوان ادیبوں کے کیمپ میں ہاسٹل کے دروازے پر ہوئی تھی۔ دروازے پر کھڑا وہ کیمپ میں شرکت کرنے والوں کا استقبال کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اور منہ سے بولا'

"عمر رضا! جوہر آباد سے۔"

"ہائیں... آپ" میں حیران ہوا۔ "آپ سے مل کر

بہت خوشی ہوئی۔"

"آپ کی تعریف .....؟" اس نے میرا تعارف چاہا۔ "ابھی بغیر تعریف کے ہوں ....." میں نے یونہی کہہ دیا۔ اس نے محسوس نہ کیا' وہ اس بات پر بھی کِھل اُٹھا۔ اس کے بہترین مصنّف قرار دیئے جانے کی گونج میرے کانوں میں مسلسل گونج رہی تھی۔ کیمپ میں سب اسے پسند کرتے تھے۔ اور اس کے ایوارڈ ملنے پر سب کو ہی خوشی ہوئی تھی۔ حسد کے باوجود پتہ نہیں کیوں اس کی شخصیت مجھے اچھی لگنے لگی۔ میں اسے دل ہی دل میں چاہنے لگا تھا۔ کیمپ کے دوران میں ہمیں بچوں کے رسائل کا سیٹ دیا گیا۔ میں ایک رسالہ اُٹھا کر عمر رضا کی تحریر پڑھنے لگا۔ اس کی تحریر میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور پڑھتے پڑھتے عجیب سی روحانی خوشی حاصل ہونے لگی۔ وہ جیسا اپنی تحریروں میں لکھتا تھا بالکل ویسا ہی تھا۔

دورانِ کیمپ ہر ایک اس کی قدر کیا کرتا تھا۔ سب ہی اس کی باتیں غور سے سُنتے۔ اس کی زبان میں مٹھاس اور شیرینی تھی۔ وہ دوستوں کو ہنساتا بھی تھا۔ لیکن اخلاق سے گری ہوئی کوئی حرکت نہ کرتا۔ لڑکے آپس میں ایک دوسرے کو ہُوٹ کرتے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور اپنی قابلیت جتانے میں لگے رہتے لیکن وہ کبھی کوئی دل دُکھانے والی بات نہ کرتا۔ قابلیت ہوتے ہوئے بھی نہ جتاتا۔ نہ کسی کو ہوٹ کرتا۔ کیمپ میں آخری رات مجھے نیند نہ آئی۔ میں بے چینی سے بستر میں کروٹیں بدلتا رہا۔ بہترین مصنّف' عمر رضا..... عمر رضا" کے الفاظ میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔ اسے انعام مل گیا اور ایک اچھا مصنّف ہونے کے باوجود میں محروم رہا۔ ایسا کیوں ہے؟ کیوں ملا اسے انعام؟" "نہیں بالکل ٹھیک فیصلہ ہوا ہے۔" میرے دل نے کہا اور پھر میں پُرسکون ہو کر سو گیا۔ صبح نماز اور درسِ قرآن سے فارغ ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ گیارہ بجے کیمپ کا اختتام ہوا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد سارے ادیب ایک دوسرے سے گلے مل کر رخصت ہوئے۔

گھر پہنچا' کچھ دنوں بعد ابا جان نے جوہر آباد جانے کا حکم دیا۔ میں خوش ہو گیا۔ کیونکہ میں جس شہر میں جا رہا تھا۔ وہاں ہماری پانچ ملیں تھیں۔ لیکن خوشی کی وجہ اور تھی۔ وہ یہ کہ عمر رضا بھی جوہر آباد کا رہائشی تھا۔ اب اس سے ملنے کا موقع پیدا ہوا تھا۔ اور اب میں اسے اور قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔

میں مین اسٹاپ پر اُترنے کی بجائے جوہر آباد کے ڈگری کالج کے اسٹاپ پر اُتر گیا۔ میرے دل میں تجسّس اور ذہن میں شوق تھا عمر رضا سے ملنے کا۔ اسی وجہ سے میں آگے نہیں گیا حالاں کہ مجھے

پتا تھا کہ وہاں میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ فیکٹری کی گاڑی موجود ہوگی۔

میں نے جیب سے ڈائری نکالی اور عمر رضا کا پتا دیکھا۔ یہاں سے چند قدم آگے جی ٹین کے ساتھ اس کا گھر تھا۔ میں پیدل ہی چل پڑا۔

میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ سامنے سبزی کی ریڑھی کے پاس کھڑا تھا "عمر رضا!" میں نے اسے پکارا۔

"آپ اور یہاں" وہ حیران ہوا اور پھر بڑی گرم جوشی سے مجھ سے بغل گیر ہو گیا پھر ریڑھی والے کو پیسے دیئے، اور شاپر اُٹھا کر بولا "آیئے میرے ساتھ، گھر چلیں۔"

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

مسجد کے پاس سے گزرے۔ تھوڑا اور چلنے کے بعد ہم کچی آبادی میں داخل ہوئے۔

میں عمر رضا کے گھر میں موجود تھا ایک کچا کمرہ بنا ہوا تھا، چار دیواری تو تھی ہی نہیں۔ وہ چارپائی پر بائیں جانب بیٹھنے لگا۔ میں ادوائین کی طرف سرک گیا۔ دائیں طرف جگہ خالی ہو گئی اسے مجبوراً "ادھر بیٹھنا پڑا۔

اس کے گھر والوں نے سادہ پانی دیا اور اس کے بعد چائے پیش کی گئی۔ میں نے اپنی ساری کیفیت اسے سُنادی اپنے دل کے حسد کا سارا قصّہ۔ کچھ وقفہ کے بعد بولا تو میں سمجھا وہ کہے گا۔ حسد نہیں کرنا چاہئے۔ حسد انسان کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ سوکھی لکڑی کو..... لیکن اس نے کہا۔

"میرے والد' پرائمری پاس تھے اور ایک معمولی سپاہی تھے۔"

"تھے؟" میں حیران ہوا۔

"ہاں..... آپ بولیں نہیں پہلے میری باتیں سُنیں" وہ بولا۔ "بقول میرے والد" وہ بولا "۶ ستمبر ۱۹۶۵ء صبح پانچ بجے بھارتی فوجی پاکستانی سرحد کی طرف بڑھے۔ ان کے آگے بڑھنے کے شور شرابے سے ہمارے کان بھی کھڑے ہوئے۔ ہماری دوربینوں نے فوجی درندوں کو دیکھ لیا۔ تاحد نظر بھارتی فوجی ہی نظر آئے۔ ان کے پاس ہیوی توپ خانہ اور ٹینکوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ دفاع کی غرض سے سرحد پر ہماری چند کمپنیاں موجود تھیں۔ ہمارے میجر نے چھاؤنی فون کیا انہیں ساری صورتِ حال بتائی۔ ٹینک شکن توپوں کے بھیجنے کا حکم دیا گیا۔ ہمارا ملک ابھی اٹھارویں سال میں تھا۔ ابھی اس کے دودھ کے دانت بھی نہیں گرے تھے کہ دشمن ہمارے ملک کو اپنے اندر جذب کرنے کی وسیع پلاننگ مکمل کر چکے تھے۔

فیروز پور روڈ' اور ہریکے روڈ کی طرف سے دشمن لاہور پر حملہ آور ہونے کے لئے جنگ شروع کر چکا تھا۔

ٹینک شکن توپیں پہنچ گئیں تو ہم کسی آڑ کی تلاش میں لگ گئے۔ وہاں کوئی آڑ نہ تھی۔ ہمیں ایک گڈا نظر آگیا۔ ہم نے اس گڈے کی اوٹ میں توپ نصب کی اور دشمن پر فائر کھول دیا۔ ہماری توپ آگ کے گولے برسانے لگی۔ دشمن کی طرف سے شعلے بلند ہونے لگے۔ ہم نے دشمن پر تین حملے کیے۔ آخری حملہ صبح نو بجے کیا گیا۔ دشمن کے دو ٹینک تباہ ہو گئے اور لاشوں کے انبار لگ گئے۔

بہترین پلاننگ اور تین اطراف سے لاہور پر حملہ کرنے کی باوجود اسے کچھ حاصل نہ ہوا۔ ہماری فوج ان کے علاقوں میں داخل ہو چکی تھی۔ بالآخر روسی وزیراعظم کی منت سماجت کر کے دشمن نے ۱۷ روز بعد جنگ بند کروائی۔" "لیکن ان باتوں کا میرے حسد کے قصّے سے کیا تعلق ....." میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ میں حیران تھا۔ میں نے اس سے کہا کچھ تھا اور اس کا جواب کچھ اور مل رہا تھا۔ عمر رضا کہہ رہا تھا :

"جنگِ ستمبر کے کچھ سالوں بعد میرے ابو کی ڈیوٹی ڈھاکہ چھاؤنی لگائی گئی۔ وہ اپنا بکس اُٹھائے ڈھاکہ پہنچ گئے۔" ابو کہتے تھے : "ڈھاکہ کے حالات ان دنوں خراب تھے تعصّب مذہب کو نگل رہا تھا۔ میری ڈیوٹی احمد بنک پر بطور سیکورٹی گارڈ لگائی گئی۔ قانون کافی سخت تھا۔ بغیر تلاشی کے ہم کسی بھی شخص کو اندر نہیں جانے دیتے تھے۔ ایک آدمی کی تلاشی ہم نے لی۔ اس کے پاس کچھ نہ نکلا۔ میری نظر اس کے ہاتھ پر پڑی۔ میں نے رسالہ لے لیا' اور اسے اندر جانے دیا۔

رسالہ کھول کر میں پڑھ رہا تھا' پرائمری پاس تھا۔ اُردو پڑھ سکتا تھا۔ میں جوں جوں پڑھتا جاتا میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی۔ "اُف اللہ! پاکستان کے خلاف اتنا زہر!!"

آئندہ سے میں نے تہیہ کرلیا کہ اپنے اس مشرقی حصے سے شائع ہونے والے ہر رسالہ کا مطالعہ کروں گا۔

(۱) بنگالی کو قومی زبان بنایا جائے۔

(۲) ہماری دولت پر ہمارا اختیار ہے۔

(۳) ہماری زبان مختلف ہے لہٰذا ہم بحیثیت قوم بھی الگ ہیں۔

اس قسم کے کئی خیالات میں نے ان رسالوں میں پڑھے۔ اپنے طور پر میں نے ان رسائل کی جاسوسی بھی کروائی۔ یہ سب کارستانی انڈیا کی تھی جو اپنے ذہن سے ہمارے قلم چلوا رہا تھا۔

پھر میں نے تہیّہ کرلیا کہ میں اپنے بیٹے کو مصنّف بناؤں گا جو اپنے دماغ سے اپنے مذہب' اپنے ملک' اپنی ملّت کے بارے میں لکھے گا۔ ذہن بھی وہ اپنا استعمال کرے گا اور قلم بھی خود ہی

چلائے گا۔ وہ بہکے گا نہیں اور جھکے گا نہیں۔

پھر میرے ابو ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شہید ہو گئے تعصب کے خلاف، ظلم کے خلاف حق کے لئے لڑتے ہوئے۔ ان کی خواہش میں نے پوری کر دی اور ان کا مشن میری تحریروں میں جاری ہے۔" عمر رضا نے دھیرے سے کہا میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میں نے اس کے آنسو پونچھے نہیں بلکہ کہا "میرے دل کے حسد کا ان باتوں سے کیا تعلق؟" "میں سمجھا تھا آپ سمجھ گئے ہوں گے۔" وہ اپنے آنسو پونچھ کر بولا۔ "چلئے میں بتا دیتا ہوں آپ بہت اچھا لکھتے ہیں لیکن سچ سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ سچ لکھئے، اپنا ذہن استعمال کیجئے۔

غیروں کی اندھی تقلید چھوڑ دیجئے، اپنے قومی تشخص اور ملی جذبے کو ابھاریئے۔ اپنی تحریر لکھتے وقت قرآن و سنت کی روشنی پیشِ نظر رکھئے آپ میں کبھی حسد پیدا نہیں ہو گا، آپ کبھی تعصب نہیں برتیں گے ....!!!" اتنا کہہ کر عمر رضا ایک لمحے سانس لینے کو رُکا۔ پھر دوسرے ہی لمحے بولا، اور آپ کو معلوم ہے تعصب کب پیدا ہوتا ہے جب کسی کا حق مارا جاتا ہے، جب کسی کے ساتھ ناانصافی کی جاتی ہے..... اور مجھے یہ بھی معلوم ہے آپ کے ابو جو اس شہر کے بڑے مل اونر ہیں۔ وہ بھی تعصب کا شکار ہیں۔ وہ اپنی ملوں میں صرف اپنی ہی ذات برادری کے لوگوں کو بھرتی کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کے بارے میں ان کا بڑا سخت رویّہ ہے۔ آپ کو اس تعصب کے خلاف بھی لکھنا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ جب ظلم کے خلاف آپ لکھنے جا رہے ہیں اس سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟ خون کے رشتوں کو بھی حق کے لئے فراموش کر دینا پڑتا ہے۔" عمر رضا کچھ دیر کے لئے پھر خاموش ہوا پھر بولا تو اس کی آواز میں ایک جذبہ تھا، عزم تھا وہ کہہ رہا تھا۔

"جس طرح فوجی ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں اسی طرح ہم ادیب بھی اپنے وطن، اپنی ملّت کی نظریاتی سرحدوں کے محافظ ہیں۔ قلم ہمارا ہتھیار ہے۔ اس کے ذریعے ہم اپنے وطن اور اپنی ملّت کے لوگوں کی مؤثر حفاظت کر سکتے ہیں..... کیا تم حسد اور تعصب کو بھلا کر میرے مشن کا ساتھ دو گے؟؟" عمر رضا کا ہاتھ میری طرف بڑھا ہوا تھا اور وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ مجھے اس لمحے اپنا قد بہت چھوٹا اور اس کا قد بہت اونچا لگا۔ "آج سے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں قلم کے ذریعے ظلم سے لڑوں گا!!" یہ کہتے ہوئے ایک پر عزم جذبے سے میں نے عمر رضا کا ہاتھ تھام لیا۔ ہاتھ تھامتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میرا قد اس کے قد کے برابر ہو گیا ہو!!

ننھی گڑیا

سید انیس احمد

وجیہہ ہے ننھی سی گڑیا ہماری
ہے چہرہ بھی دلکش، ادائیں بھی پیاری!
ادب سے بڑوں کا وہ سنتی ہے کہنا
تبھی تو ہے گھر میں وہ سب کی دلاری
اٹھاتے ہیں سب ناز اس نازنیں کا
جو ہو باپ صدقے، تو ماں جائے واری
چہکتی ہے چڑیوں کی مانند ہر دم
وہ کرتی ہے باتیں بڑی پیاری پیاری
ستاتی نہیں اپنی بے جا ضدوں سے
بتائی جو بات اس نے دل میں اتاری
نہ چھینے، نہ شے وہ کسی کی اٹھائے
بس اپنی ہی چیزوں سے رکھتی ہے یاری
نہ پھاڑے کتابیں، نہ پھینکے کھلونے
سجی ہے سلیقے سے اس کی پٹاری
نہ کپڑے ہیں میلے نہ منہ ہاتھ گندے
سدا صاف رکھتی ہے چیزیں وہ ساری
نہ روئی ذرا بھی کبھی چوٹ کھا کے
اٹھی ہنس کے جب بھی گری وہ بچاری
ہے منی سی لیکن بہادر بہت ہے
کسی شے کا اس پر نہیں خوف طاری
وہ جب دور ہوتی ہے نظروں سے میری
کوئی آ کے دیکھے مری بے قراری!
نہ غم کا پڑے اس پہ سایہ بھی یارب
کبھی بھی نہ آنکھوں سے ہوں اشک جاری

جانور کیسے باتیں کرتے ہیں

نگہت آرا چوہان

جانور ہماری طرح گفتگو نہیں کر سکتے لیکن ایک دوسرے کو خبردار کرنے اور اطلاع دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں ایسا کرنے میں وہ الفاظ استعمال نہیں کرتے بلکہ دوسرے ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر پرندوں کو لیجئے مرغی اپنے بچوں کو خطرہ سے آگاہ کرنے کے لئے ایک خاص آواز نکالتی ہے جس سے بچے سہم کر اپنی اپنی جگہ دبک جاتے ہیں اور جب دوسری آواز نکالتی ہے تو سب اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ جنگلی پرندے راتوں میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک پرواز کرتے ہیں تو اپنی مخصوص آوازیں نکالتے ہیں تاکہ سب ایک ساتھ رہیں اور کوئی بھٹک بھی جائے تو ان کی آوازوں کو سن کر اپنے جھنڈ سے جا ملے۔

انسانوں میں بھی بات چیت کے علاوہ اظہارِ مطلب کے اور طریقے رائج ہیں چنانچہ استعجاب اور حیرت کے موقوں پر حروف فجائیہ جیسے اوہ، آہ وغیرہ بے ساختگی سے ادا ہوتے ہیں جنہیں سننے کے بعد مطلب فوری طور پر سمجھ میں آ جاتا ہے اسی طرح لاپرواہی کے اظہار کے لئے اکثر اپنے شانوں کو ہلا دیتے ہیں اور ساتھی اس کا مفہوم فوری طور پر سمجھ

جاتے ہیں۔

جانور نہ تو بات چیت کر سکتے ہیں اور نہ الفاظ اور جملوں کا استعمال لیکن ان کی آوازیں جملوں کا کام دیتی ہیں مرغی اپنے چوزوں کو خبردار کرنے کے لئے ایسی ہی آوازیں نکالتی ہے۔ گھوڑا ہنہناتا ہے یا زمین پر ٹاپ مارتا ہے تو اس کی یہ حرکت دوسرے گھوڑوں کے لئے یقیناً معنی خیز ہوتی ہے اور اس کا ضرور کوئی مطلب ہوتا ہے۔ آواز و حرکات کے علاوہ بو بھی بعض جانوروں کے مابین خبر رسانی کا ایک ذریعہ ہے۔ غول میں رہنے والے جانور مثلاً ہرن یا جنگلی ہاتھی وغیرہ اسی سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ ہرن بو کی وجہ سے ایک دوسرے سے قریب تر رہتے ہیں۔ جب وہ گھاس کھاتے ہیں تو اپنے نتھنوں سے زمین پر ایک خاص بو چھوڑ دیتے ہیں اسی طرح ان کے چلنے سے بھی ایک خاص بو زمین میں بس جاتی ہے چنانچہ بھٹکا ہوا ہرن اس بو کی مدد سے اپنے غول سے جا ملتا ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ کتے ایک دوسرے کو اپنی قوت شامہ ہی سے پہچانتے ہیں گویا آواز حرکات اور بو جانوروں کے باہمی ربط اور خبر رسانی کے ذرائع ہیں۔

بندر اور گوریلے کئی قسم کی آوازیں نکالتے ہیں اور اپنے چہرے کے مختلف اتار چڑھاؤ سے خوشی، خفگی یا بھوک کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی یہ آوازیں اور چہرے کا تغیر اور تبدل گویا ان کی بول چال ہے جن کو وہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ کتے بھونکتے، غراتے اور روتے ہیں نیز اپنے احساسات کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتے ہیں مثلاً کتوں کا دانت دکھانا، پنجے اٹھانا اور ان کے بالوں کا کھڑا ہو جانا ایسی حرکات ہیں جن کا مطلب دوسرے کتے اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں۔ انسان کو بات چیت دوسروں سے سیکھنی پڑتی ہے انسان کے بچے بات چیت سیکھنے سے قبل جانوروں کی طرح مختلف آوازیں نکالتے ہیں جو ان کے احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ رونا، چیخنا، چلانا بچوں کے مختلف احساسات مثلاً بھوک، تکلیف اور خوشی کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ان کے جبلی افعال ہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آیا بندر اور گوریلا کی بھی مختلف آوازیں اور حرکات جبلی اور پیدائشی افعال ہیں یا ان کو وہ اپنی ماں سے سیکھتے ہیں ایک تجربہ کیا گیا۔ ایک گوریلے کے بچے کو پیدائش کے ساتھ ہی پانچ برس تک اس کے ہم جنسوں سے الگ تھلگ رکھا گیا اس عرصے میں اس نے اپنے ہم نوع کی نہ کوئی آواز سنی اور نہ انہیں دیکھا لیکن جب ملنے کا موقع دیا گیا تو انہی جیسی آواز نکالنے اور حرکات کرنے لگا یہی اس کی جبلی بول چال ہے جسے سیکھنے کی ضرورت قطعاً لاحق نہیں ہوتی۔ گروہوں میں رہنے والے کیڑے مثلاً چیونٹیاں، شہد کی مکھیاں خبر رسانی کا کوئی ذریعہ ضرور رکھتی ہوں گی۔ چیونٹیوں سے متعلق بہت کم معلومات ہیں البتہ شہد کی مکھیوں کے متعلق کافی معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ شہد کی مکھیوں میں یہ صلاحیت فطری طور پر پائی جاتی ہے۔ ان کی بول چال بھی عجیب و غریب ہوتی ہے جو بو اور ناچ پر

مشتمل ہوتی ہے۔ شہد کی مکھی جب کبھی ایک رس بھرا پھول پالیتی ہے تو دیکھا گیا کہ بہت جلد مکھیوں کی کثیر تعداد رس جمع کرنے وہاں پہنچ جاتی ہے یا جب کوئی مکھی زرگل اپنے چھتے پر لاتی ہے تو اور مکھیاں اس مقام پر فوراً پہنچ جاتی ہیں۔

تجربوں سے پتہ چلا ہے کہ جب مکھی پھول، رس، یا زرگل کے ساتھ چھتے میں داخل ہوتی ہے تو وہ ان کو دوسری مکھیوں کے حوالے کر دیتی ہے جو ان کو شہد بنانے یا اپنے بچوں کی غذا کے لئے محفوظ کر لیتی ہے اور پھر زرگل لانے والی مکھی ناچنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ ناچ دو طرح کا ہوتا ہے ایک گھوم گھوم کر اور دوسرے اپنی دم کو اٹھا کر۔ یہ ناچ دراصل دوسروں کے لئے دعوت شرکت ہے چنانچہ مکھیوں کی ایک کثیر تعداد پہلی مکھی کے ساتھ ناچنا شروع کر دیتی ہے کچھ دیر بعد سب کی سب ناچنے والی چھتے سے اڑ کر پھولوں کا رخ کرتی ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تمام کی تمام ان ہی پھولوں کی طرف جاتی ہیں جن کو پہلی مکھی نے معلوم کیا تھا۔ ظاہر ہے مکھی کا یہ ناچ دوسری مکھیوں کے لئے پیغام رسانی کا ذریعہ ہے لیکن تعجب اس پر ہے کہ صحیح مقام کا تعین کس طرح کیا جاتا ہوگا کیونکہ تمام مکھیاں پہلی مکھی کی اتباع نہیں کرتیں بلکہ جدا جدا اڑتی ہیں اور پھر بھی صحیح مقام پر پہنچتی ہیں۔ شاید یہ ناچ اطلاع کے ساتھ فاصلے اور سمت کا تعین بھی کرتا ہے۔

ماہرین نے تجربوں سے پتہ لگایا ہے کہ گھوم کر اور دم اٹھا کر ناچنے سے فاصلے کا تعین ہوتا ہے اور ناچتے وقت مکھی کی سمت پھولوں کی سمت کی نشاندہی کرتی ہے۔ لیکن اس کا اندازہ کہ کسی خاص نوع کے پھولوں میں رس بھرا ہوگا غالباً پھول کی اس خوشبو سے لگایا جاتا ہے جو پہلی مکھی اپنے ساتھ چھتے پر لے آتی ہے۔ناچ کے وقت دوسری سب مکھیاں اس سے واقف ہو جاتی ہیں اور یہی مخصوص خوشبو ان پھولوں تک پہنچنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ مکھیوں کی یہ باہمی خبر رسانی گوریلوں کی بول چال کی طرح ان کا فطری اور جبلی فعل ہے نہ کہ سیکھا ہوا۔

ایک تجربہ یوں کیا گیا کہ مرغی کے بہت سے نو زائدہ بچوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا۔ پھر ایک گروہ کو الگ تھلگ اور دوسرے گروہ کو اس طرح رکھا گیا کہ وہ اپنے ہم نوع کی آوازیں سن سکے۔ ان دونوں گروہوں کے بچوں کو اسی حالت میں بڑھنے دیا گیا۔ جب وہ کافی بڑے ہوئے تو دیکھا گیا کہ اول الذکر کے بچے مرغوں اور مرغیوں جیسی آوازیں نکالتے تو ہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے مرغ بچے برابر بانگ نہیں دے سکتے حالانکہ دوسرے گروہ کے مرغ بچے اچھی خاصی بانگ دینے لگے۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ بانگ دینا قطعی فطری فعل نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق سیکھنے سے ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ بہت سے پرندے ایسے ہیں جن کو چہچہانا سیکھنا پڑتا ہے۔ نیز بہت سے ایسے پرندے دنیا میں پائے جاتے ہیں جو

دوسرے پرندوں کی بولیاں نقل کرتے ہیں۔ ان سب میں طوطا زبردست نقال ہوتا ہے۔ کیا جانور انسان کی بول چال سمجھ سکتے ہیں؟ اس کا جواب پالتو جانوروں کے شائقین ضرور اثبات میں دیں گے لیکن حقیقت ایسی نہیں ہے۔ کتا انسان کے صرف لہجے کو سمجھتا ہے، الفاظ کو نہیں اگر سخت لہجے میں کہیں کہ "میں تیرے کھانے کے لئے گوشت لایا ہوں۔" تو وہ مارے ڈر کے پچھلی ٹانگوں میں اپنی دم دبالے گا۔ بہرحال کتوں کو اس طرح ضرور تربیت دی جاسکتی ہے کہ وہ حکم کے الفاظ پر عمل پیرا ہوں چاہے حکم دینے والا نظروں کے سامنے ہو یا اوجھل۔

ایک دلچسپ سوال یہ ہو سکتا ہے کہ آیا جانور طلب یا اظہار خواہش پر قادر ہیں یا نہیں۔ اس کا خواہ طریقہ یا ذریعہ کچھ ہی کیوں نہ ہو پالتو جانور ضرور اس کی صلاحیت رکھتے ہیں کیونکہ وہ مانگنے یا اظہار خواہش کا طریقہ ہم سے سیکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ کتا کھانا مانگنے کا طریقہ انسان سے سیکھ لیتا ہے اور پالتو بلی اپنی مخصوص آواز نکال کر اپنے مالک سے گھر کا دروازہ کھلوالیتی ہے۔ جنگلی جانور جب بھوکے ہوں تو صرف چلانا جانتے ہیں جو ایک فطری فعل ہے۔ ان میں طلب کا کوئی خاص طریقہ یا اظہار خواہش کا مخصوص ذریعہ نہیں ہوتا۔ صرف پالتو جانور ہی ان طریقوں یا ذرائع کا استعمال جانتے ہیں، جنہیں وہ انسان سے سیکھ لیتے ہیں۔

انسان اور جانور میں یہی تو فرق ہے کہ انسان اپنے احساسات و خواہشات کی پوری تر جمانی الفاظ اور جملوں کے ذریعے کرنے پر قادر ہے۔ لیکن جانور صرف مخصوص آواز اور حرکات سے اس کا اظہار کر سکتے ہیں۔ بندر کو ناریل دے دو تو اس کے چہرے سے خوشی کا اظہار ہوگا۔ اگر ناریل چھین لو تو غم و غصے کا تاثر دے گا۔ جس کا وہ الفاظ اور جملوں کے ذریعے اظہار نہیں کر سکتا جس طرح ہم کر سکتے ہیں۔ وہ ناریل دے دو کے الفاظ ادا نہیں کر سکتا۔ جانور الفاظ اور جملوں کے ذریعے بات چیت نہیں کرتے بلکہ اظہار مطلب کے اور طریقے یا تو فطرت انہیں سکھلا دیتی ہے یا وہ ماحول کی بدولت سیکھ لیتے ہیں۔

سچے موتی

☆ اپنے دوست کے انتخاب میں بہت احتیاط سے کام لو کیونکہ دوست زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔

☆ ہر چیز کا حسن ہوتا ہے نیکی کا حسن یہ ہے کہ فوراً" کی جائے۔

☆ مصائب سے مت گھبرائیے کیونکہ ستارے اندھیرے میں ہی چمکتے ہیں۔

☆ خاموشی انسان کے وقار کو بڑھاتی ہے۔

☆ کسی انسان کا دل نہ دکھاؤ۔ کیونکہ حقوق العباد کو فوقیت حاصل ہے۔

☆ زیادہ بولنے سے انسان کی عقل مفلوج ہو جاتی ہے۔

مرسلہ : نجم الحسن، مظفر گڑھ

خوف کی اِک اور وادی کا سفر
ہو رہا ہے آپ کے اِصرار پر
پہلے سے زیادہ خوفناک کہانیوں، واقعات، حادثات اور مضامین کے جلوس کے ساتھ
آنکھ مچولی
کا ایک اور
خوفناک نمبر
نومبر ۱۹۹۵ء میں شائع ہو رہا ہے۔
مگر اس خوفناک نمبر کے لئے آپ بھی تو کچھ لکھئے، مثلاً
کوئی خوفناک کہانی یا واقعہ، کوئی سنسنی خیز نظم یا حادثہ
دہشت سے متعلق کوئی مضمون
کوئی دل ہلا دینے والی داستان
یا کوئی خوفناک تصویر
لفظ لفظ خوف سے تھرتھراتا ہوا
حرف حرف ہیبت سے پھڑپھڑاتا ہوا
جلدی کیجئے
خوفناک نمبر کیلئے بے خوف ہو کر لکھئے
آنکھ مچولی آپ کی تحریروں کا منتظر ہے
ہر قابلِ اشاعت تحریر کا معاوضہ دیا جائے گا ----

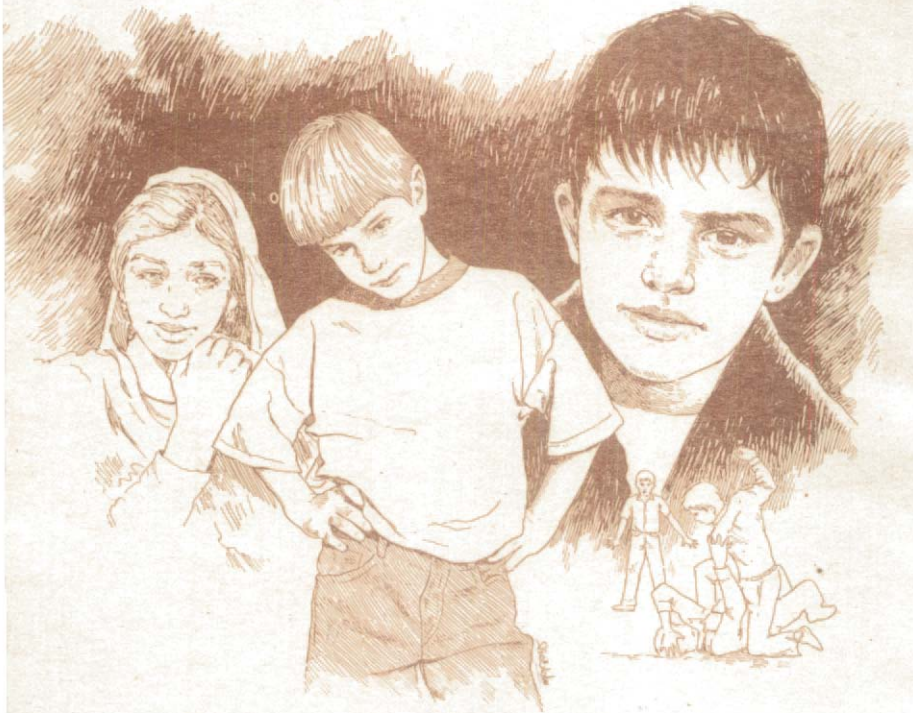

ملاپ

نزہت کلیم

امی فجر کی نماز پڑھنے کے بعد ابھی باورچی خانے کا رخ کر ہی رہی تھیں کہ رضوان اور کامران کے کمرے سے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔

"یا اللہ ان بچوں کو تو صبح صبح بھی چین نہیں ہے۔ ابھی تو میں ان کو نماز کے لئے اٹھا کر آئی تھی۔" امی بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔

رضوان اور کامران جائے نماز پر بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ امی کو دیکھتے ہی رضوان بولا۔

"امی یہ کامران کا بچہ مجھے نماز میں ہنسا رہا تھا۔"

"اور امی، رضوان بھائی نے میرے پیر پر اپنا پاؤں رکھا تھا اور میں نماز میں گرتے گرتے بچا

تھا۔" امی نے پریشان ہو کر اپنا سر تھام لیا۔ "بیٹا آپ لوگ اس طرح لڑیں گے تو آپ کے ابو کیا کہیں گے۔ میں آپ لوگوں کو اتنا سمجھاتی ہوں اور آپ لوگ ہیں کہ لڑنا ہی نہیں چھوڑتے۔" یہ کہتے ہوئے امی نے دوبارہ باورچی خانے کا رخ کیا۔

رضوان اور کامران کی عمروں میں سال بھر کا فرق تھا۔ عمروں کے اس طرح کے فرق سے ان کو اسکول میں بھی آگے پیچھے ہونا چاہئے تھا لیکن رضوان شدید بیماری کی وجہ سے ایک سال امتحان نہ دے سکا اس طرح دونوں بھائی ایک ہی کلاس میں تھے۔

دونوں بھائیوں کی آپس میں کبھی نہیں بنتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ کامران کے آنے سے رضوان کو ملنے والے پیار و محبت میں تھوڑی بہت کمی ضرور ہو گئی تھی جس کو رضوان قبول نہ کر سکا تھا۔ حالانکہ امی کو چھوڑ کر باقی سب کا رویہ پہلے جیسا ہی تھا، بس امی کو چونکہ کامران کو بھی دیکھنا پڑتا تھا اس لئے وہ رضوان پر اتنی توجہ نہیں دے پاتی تھیں جیسے پہلے دیا کرتی تھیں لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ انہوں نے رضوان کو پیار کرنا ہی چھوڑ دیا ہو۔ پھر بھی رضوان کو کامران سے ایک طرح کی جلن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ اکثر کوشش کرتا کہ کسی نہ کسی طرح کامران کو تکلیف پہنچائے اور اس کو روتا دیکھ کر خوش ہو۔

کامران شروع میں تو صرف رو دھو کر خاموش ہو جاتا تھا مگر اسکول جانے کی عمر تک کامران کا غصہ بھی بڑھنے لگا۔ اور اب دونوں بھائی ایک دوسرے سے زبان چلانے اور ایک دوسرے کو مارنے پیٹنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ جتنی دیر وہ دونوں گھر میں رہتے ایک ہنگامہ بپا رہتا۔

امی جلدی جلدی ناشتا تیار کر رہی تھیں ڈر تھا کہ بچوں کو اسکول پہنچنے میں دیر نہ ہو جائے۔ ناشتہ تیار ہوا تو اسے جلدی سے میز پر رکھ کر کمرے میں داخل ہوئیں۔ "ارے بچو جلدی کرو اسکول پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔ کامران کیا ہوا تم نے ابھی تک جوتے نہیں پہنے؟"

"امی! یہ رضوان بھائی نے میرے جوتے کی ڈوری قینچی سے کاٹ دی۔"

کامران نے منہ بنا کر کہا۔

"اے ہے رضوان خدا تجھ سے سمجھے، کیوں چھوٹے بھائی کو ستاتا ہے؟"

"ہاں ہاں ستاؤں گا اس نے بھی تو کل میرے بیگ پر پینسل سے لکیر ڈالی تھی۔" رضوان اکڑ کر بولا۔

کامران نے صفائی پیش کرنے کے لئے منہ کھولا لیکن امی نے جھڑک دیا۔ "اب چپ ہو جاؤ

اور جلدی سے تیار ہو جاؤ میں اتنے میں جوتے کی ڈوری الماری سے نکالتی ہوں شاید اسی لئے تمہارے ابو تھوک کے حساب سے ہر چیز لاکر رکھتے ہیں۔ اور ہاں رضوان دیکھو میں نے میز پر آپ دونوں کے فیس کارڈ اور فیسیں رکھ دی ہیں وہ یاد سے لے جانا کل بھی آپ کے سر ناراض ہو رہے تھے اچھا شاباش جلدی جلدی ناشتہ کرو میں آپ کے ابو کو بھی ناشتہ دے آؤں نہیں تو منی جاگ جائے تو مشکل ہو جائے گی اور اب لڑیئے گا نہیں آپ دونوں تو بہت پیارے بیٹے ہیں نا..." یہ کہتے ہوئے امی نے پھر باورچی خانے کا رخ کیا۔

اسکول لگ چکا تھا۔ سارے بچے اپنی اپنی کلاسوں میں بیٹھ چکے تھے۔ سر کے اندر داخل ہوتے ہی تمام بچوں نے کھڑے ہو کر ادب سے ان کو سلام کیا۔

سر نے بچوں کی حاضری لینا شروع کردی۔ حاضری کے بعد سر نے کہا۔

"جن بچوں کی فیس رہ گئی تھی وہ اپنی فیس ادا کردیں کیونکہ میں نے کل بھی کہا تھا کہ جو بچے آج فیس نہیں لائیں گے میں ان کو سزا دوں گا۔" ماسٹر صاحب نے یہ کہتے ہوئے رجسٹر کھول لیا۔

ہاں بھئی رضوان اور کامران اپنی فیس لائیں۔" رضوان فیس دینے کے لئے ماسٹر صاحب کے پاس پہنچ گیا پھر سر نے کامران کا نام لیا' کامران چونکا۔

کیا رضوان بھائی نے اس کی فیس ادا نہیں کی "بھائی امی نے تو دونوں کی فیس دی تھی۔" کامران بولا۔

"مجھے کیا معلوم میں نے تو اپنا کارڈ اٹھایا تھا تم بھی اپنا کارڈ اٹھا لیتے۔" کامران کے دل میں نفرت کی ایک لہر اٹھی اس نے سوچا کیا ہو جاتا اگر یہ میری فیس بھی لے آتے انہوں نے تو میرا جینا دوبھر کردیا ہے۔ ادھر رضوان صاحب اپنی سیٹ پر پہنچ کر مسکرا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر عامر نے چپکے سے کہا'

"رضوان تم نے اچھا نہیں کیا۔"

"کیا اچھا نہیں کیا میرا تو دل چاہتا ہے کہ اس کی ٹانگیں توڑ دوں۔" رضوان نے کھسر پھسر کے انداز میں جواب دیا۔ عامر یہ سن کر خاموش ہو گیا سر نے رجسٹر پر سے سر اٹھا کر کہا "اچھا کامران آپ کل ضرور فیس لے کر آئیے گا۔ اچھا بھئی اب عبدالخالق اور عبدالواحد اپنی فیس لائیں۔

"سر آج واحد اور خالق تو نہیں آئے" ایک بچے نے کھڑے ہو کر کہا "ارے ارے بچو! آپ کو ان کا پورا نام لینا چاہئے۔"

اتنے میں عبدالواحد اور عبدالخالق دروازے پر نظر آئے "سر ہم آسکتے ہیں۔" آپ لوگ اتنی دیر میں کیوں آتے ہیں۔" سر ہماری وین خراب ہوگئی اس لئے میں اور واحد دونوں پیدل آئے ہیں۔" "اچھا آیئے کلاس میں مگر آپ نے اپنے بھائی کو عبدالواحد کیوں نہیں کہا؟"

"کیوں سر ہمیں تو گھر میں بھی سب واحد اور خالق کہتے ہیں۔"

"ہاں بیٹا ضرور کہتے ہوں گے مگر دیکھئے نا واحد اور خالق تو اللہ کی ذات ہے۔ یہ نام تو اسے ہی زیب دیتا ہے کوئی انسان واحد اور خالق تو نہیں ہو سکتا۔" "مگر سر ہمارے گھر والوں نے تو یہی نام رکھا ہے۔"

نہیں بچو آپ کے گھر والوں نے تو آپ کا نام عبدالخالق اور عبدالواحد رکھا ہے یعنی اللہ کا بندہ' ایک واحد ذات کا بندہ۔"

مگر سر اس میں ہمارا کیا قصور یہ تو ہمارے امی ابو کا فرض تھا کہ وہ ہمارے ایسے نام نہ رکھتے۔"

نہیں بیٹا نام تو آپ کا بہت اچھا ہے آپ کے بڑوں نے اسے ادا کرنے کا انداز غلط اپنایا ہے۔ اب آپ یہ کرسکتے ہیں کہ جب بھی کوئی آپ کو خالق یا واحد کہہ کر پکارے آپ فوراً اسے بتائیں کہ وہ آپ کو عبدالخالق اور عبدالواحد کہا کریں اس طرح لوگوں کو ایک اچھی بات معلوم بھی ہوجائے گی اور اس بات پر عمل کرنے کی عادت بھی ہوجائے گی۔"

سر کی باتیں سب بچے بہت شوق اور توجہ سے سن رہے تھے۔ باتیں ختم ہوتے ہی کلاس میں بھنبھناہٹ شروع ہوگئی۔ کامران اور رضوان گو کہ خاموش تھے مگر ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔

اسکول کا وقت ختم ہوا چھٹی کے ساتھ ہی رضوان تیزی سے باہر کی طرف لپکا کامران جلدی جلدی اس کی طرف بڑھا' کہیں رضوان اسے چھوڑ کر ہی نہ چلا جائے دونوں کیونکہ پیدل ہی گھر جاتے تھے اور امی کا حکم تھا کہ گلیاں اور راستے سنسان ہونے کے سبب دونوں ایک ساتھ آیا کریں۔ مگر رضوان کو پھسلتی کی طرف بڑھتا دیکھ کر کامران ایک درخت کے نیچے خاموش کھڑا ہوگیا۔ ایک دوسرے سے بات چیت بند ہونے کی وجہ سے گھر جانے کے لئے کہنا اس کی انا کا مسئلہ بن گیا تھا۔ ویسے اس نے دل میں طے کرلیا تھا کہ آج امی سے شکایت کرکے رضوان کی اچھی طرح پٹائی کروائے گا۔

رضوان دیر تک پھسلتا رہا۔ جنید جو کلاس کا خاصا بدتمیز اور شرارتی لڑکا تھا بولا :

"ارے یار' رضوان تو خود اکیلے ہی پھسل رہا ہے اپنے بھائی کو کیوں نہیں بلا لیا۔"

کیوں بلاؤں میرا تو دل چاہتا ہے کہ اس کو یہاں سے اتنی زور سے گراؤں کہ اس کا سر پھٹ جائے۔" جنید بجائے اس کو منع کرنے کے خوشی سے قہقہے لگانے لگا اور وہیں سے چلایا۔

"کامران آؤ تم بھی آجاؤ ہم لوگ بھی پھسلتے ہیں" کامران نے یہ سن کر آہستہ آہستہ قدم بڑھادیے۔ رضوان کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ کیا کہہ سکتا تھا۔ کامران جب پھسلنے لگا تو جنید نے رضوان سے کہا۔

"یار اچھا موقع ہے" مگر رضوان نے کچھ جواب نہ دیا وہ نہ جانے کیا سوچ رہا تھا یہ دیکھ کر جنید نے خود ہی کامران کو پورے زور سے دھکا دے دیا۔ کامران منہ کے بل جاکے گرا اور اس کے ماتھے اور منہ سے خون نکلنے لگا یہ دیکھتے ہی رضوان یہ کہتا ہوا تیزی سے جنید کی طرف لپکا۔

"میرے بھائی کو تم نے کیوں گرایا؟" وہ جنید کے اوپر پل پڑا مگر جنید ڈیل ڈول میں رضوان سے زیادہ تھا' اسے دھکا دے کر ایک طرف کرتے ہوئے بولا "ابھی تھوڑی دیر پہلے تو خود ہی چاہ رہا تھا اب کس لئے تجھے رحم آرہا ہے میں نے تو تیری ہی خوشی کی بات کی ہے۔"

رضوان غصے سے دیوانہ ہو کر اس کو مارنے کے لئے لپکا تو جنید نے قریب پڑا پتھر رضوان کے سر پر کھینچ کر مارا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ رضوان بھی چکرا کر وہیں گر پڑا اور اس کے بھی ماتھے سے خون بہنے لگا۔

بچے ہیڈ ماسٹر صاحب کو بلا لائے۔ دونوں بچوں کو اٹھایا گیا اور قریبی ہسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر نے زخم گہرا دیکھ کر دو دو ٹانکے لگادیے اور سر پر پٹی کردی اس کے بعد انہوں نے بچوں کو گھر لے جانے کی اجازت دے دی۔

رضوان اور کامران کو اسکول سے واپس آنے میں دیر ہوگئی تھی۔ امی جائے نماز پر بیٹھی دعائیں مانگ رہی تھیں ساتھ ہی آنسو بھی رواں تھے وہ ہلکی آواز میں یہی کہے جارہی تھیں۔

"اللہ ان بچوں پر اپنا کرم کرنا' ان دونوں کو سیدھے راستے پر چلانا ان دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت پیدا کرنا۔"

گھنٹی بار بار بج رہی تھی۔ امی نے گھبرا کر جلدی سے چہرے پہ ہاتھ پھیرا اور باہر کی طرف بھاگیں۔

دروازہ کھولتے ہی کامران اور رضوان کو اس حالت میں دیکھ کر ان کی بے اختیار چیخ نکل گئی۔ سر جلدی سے آگے بڑھے۔

"دیکھئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں بچے کھیلتے ہوئے گر پڑے ہیں۔ دو دو معمولی ٹانکے آئے ہیں۔ زخم جلدی بھر جائے گا انشاء اللہ۔ ان کو کچھ کھانے کو دیں اور آرام کرنے دیں۔" سر نے یہ

کہہ کر واپسی کے لئے قدم بڑھائے۔ رضوان کی امی نے ان کو روکنا چاہا مگر وہ یہ کہہ کر چلے گئے کہ ان کو اپنی بیٹی کو کالج سے لینے جانا ہے اور وہ پہلے ہی خاصے لیٹ ہو چکے ہیں۔

رضوان اور کامران کو امی نے ان کے بستروں پر پہنچایا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ان دونوں کو گرم گرم دودھ اور کچھ کھانے پینے کو دیا۔ سر جو دوا دے گئے تھے دونوں کو کھلائی، پھر انہیں لٹادیا اور خود وہیں منی کو لے کر قالین پر لیٹ گئیں۔ شام تک ابو بھی آگئے اور پڑوسیوں کو بھی پتہ چل گیا کہ رضوان اور کامران کے چوٹ لگ گئی ہے، جو بھی سنتا ان کی عیادت کو چلا آتا سب یہی سمجھ رہے تھے کہ دونوں کھیل کھیل میں گر گئے ہیں۔ وہ دونوں خاموش تھے، ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔

رات کو امی نے کھانا کھلا کر دونوں کو دوا کھلائی اور سوجانے کی ہدایت کر کے خود باورچی خانے میں چلی گئیں۔ امی کے جانے کے بعد رضوان اور کامران نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک جھٹکے سے دونوں اٹھے۔ کامران، رضوان سے لپٹ گیا۔

"بھائی تم نے میری وجہ سے مار کھائی نا؟ میری وجہ سے تمہارے ٹانکے لگے ہیں، میں بہت خراب ہوں نا؟" ادھر رضوان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے وہ بولا "میرے بھائی تم کو میری وجہ سے آج تک بہت تکلیف پہنچی ہے۔ میں ہی بہت برا ہوں اگر ہم دونوں آپس میں مل جل کر رہتے تو جنید کے بچے کی کبھی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرتا۔ آج سے ہم اچھے بھائیوں کی طرح رہیں گے۔" رضوان نے کامران کو بستر پر لٹادیا اور خود بھی اس کے برابر میں لیٹ گیا تھوڑی دیر میں دونوں بے خبر سو رہے تھے۔

امی کام سمیٹنے کے بعد بچوں کو دیکھنے کے لئے کمرے میں آئیں تو دونوں کو ایک ساتھ سوتا دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ یہ دونوں تو ایک دوسرے کے قریب ہونا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ اگر بھولے سے کبھی ایک دوسرے کے بستر پر بیٹھ جاتے تو لڑائی چھڑ جاتی تھی۔ مارے خوشی کے امی کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور دل کی گہرائیوں سے انہوں نے دعا کی۔ "پروردگار تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو نے میرے بچوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈال دی اس محبت کو ہمیشہ قائم رکھنا۔"

Colorscan
ORIENT

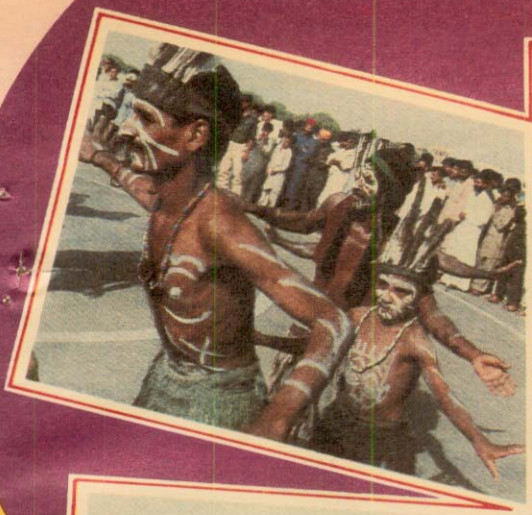

لوگ کیا کہیں گے؟

تحریر: منیر احمد راشد
عکاسی: مومن رحیم

گدھے بھی قیام امن کی دوڑ میں شریک ہو گئے۔

یہ کسی اخبار کی سرخی نہیں بلکہ آنکھوں دیکھا حال ہے۔ اخبار میں خبر پڑھی تھی کہ ۲۷ جولائی کو گدھا گاڑی ریس ہوگی۔ یہ ضلع جنوبی کراچی کے زیر اہتمام منعقد کردہ گورنر سندھ اسپورٹس فیسٹول کا آخری کھیل تھا۔ دوڑ کا افتتاح ممبر قومی اسمبلی واجہ کریم داد کو کرنا تھا اور انعامات کی تقسیم گورنر سندھ کے ہاتھوں ہونی تھیں۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی کے نمائندے وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ تو بھلا ہم کیوں پیچھے رہتے۔ لہٰذا

ہم بھی وہاں موجود تھے
ہم بھی وہ سب دیکھا کئے

گناہ گار آنکھوں اور شرمسار کانوں سے جو کچھ دیکھا سنا، آپ بھی دیکھئے، سنیئے اور ہو سکے تو سر دھنیے (ورنہ سر پیٹ لیجئے)

محمد بن مالک کو ساتھ لے کر ہم تین بجے کراؤن سینما ماڑی پور روڈ پہنچے۔ دوڑ شروع ہونے کا یہی وقت مقرر کیا گیا تھا۔ راستے میں ہم نے جگہ جگہ بینرز لگے دیکھے جن پر تحریر تھا۔

"گدھا گاڑی ریس برائے امن"

ان بینرز کو پڑھنے کے بعد ہی ہمیں اس حقیقت کا پتا چلا تھا کہ گدھے بھی قیام امن کی دوڑ میں شریک ہو گئے ہیں۔

ہم کراؤن سنیما پہنچے تو دیکھا کہ امن کے سفیروں کو زنجیروں اور رسیوں میں جکڑ کر گاڑیوں میں جوت دیا گیا ہے۔ اور ان سفیروں کے مشیر یعنی ان کو ہانکنے والے جا کی سفید بنیانیں پہنے پُرجوش انداز میں باتیں کر رہے ہیں یا ادھر ادھر آجا رہے ہیں۔ لوگ سڑک اور فٹ پاتھوں پر کھڑے تھے۔ ٹریفک پولیس کے درجنوں سارجنٹ اور بیسیوں سپاہی وہاں موجود تھے۔ ٹریفک کا نظام درہم برہم تھا۔ گاڑیاں ہارن بجاتی ہوئیں جوں کی چال چل رہی تھیں۔ پولیس کی موبائل اور کئی دوسری گاڑیاں موجود تھیں، مسلح

سپاہی اور سادہ لباس والے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے، پھرتی سے آجا رہے تھے۔ کچھ مسلح سپاہی مخصوص مقام پر چوکس کھڑے تھے۔ ایک طرف کوٹی وی کی وین کھڑی تھی اور اس کے ساتھ درجنوں موٹر سائیکلیں اور دوسری گاڑیاں موجود تھیں۔ یہ لوگ گدھا گاڑیوں کے ساتھ ساتھ بھاگنے والے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ ریس کے جج تھے۔ میرون کلر کے کوٹ پہنے ہاتھوں میں فائلیں اٹھائے دوڑ کے منتظمین، دوڑ میں حصہ لینے والوں کو اصول و ضوابط اور دیگر باتیں بتاتے نظر آئے۔ صحافی ریس کے بارے میں معلومات کرتے پھر رہے تھے۔ فوٹو گرافر کیمرے اور مووی کیمرے اٹھائے اپنے کام میں مگن تھے۔ لیڈر قسم کے دو ایک گدھے اور ان کے جاکی پریس فوٹو گرافروں کی زد میں تھے۔ وہ اپنی زبان میں کچھ بیان بھی جاری کر رہے تھے مگر وہاں موجود عوام سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے رشک بھری نظروں سے ان گدھوں کو تک رہے تھے جنہیں کل تک کوئی گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ مگر آج وہ وی آئی پی بن گئے تھے۔ اخبار اور ٹی وی والے ان کی تصاویر اتار رہے تھے۔ مووی بن رہی تھی۔ گدھے خوش تھے۔ خوشی انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ پاؤں زمین پر ٹکتے نہیں تھے۔ مسکراہٹ چہرے پر کھیل رہی تھی کہ کھیل ہی کھیل میں وہ کس قدر اہم اور مشہور ہوگئے تھے۔ گدھے کہیں کے، جانتے نہیں تھے کہ کھیل ہی میں شہرت ہے۔ اور شہرت دراصل ایک کھیل ہے جسے بدنامی بنتے دیر نہیں لگتی۔

سنیما کے کمپاؤنڈ میں ٹینٹ لگے ہوئے تھے۔ ڈھول ڈھمکے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ لوگوں کے ہجوم کا ایک دائرہ بنا ہوا تھا ہم اندر کو چلے۔ کانوں کو بند کیا۔ شور سے نجات پائی ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے۔ دائرے کے اندر سیاہ فام بلوچ بلوچی رقص پیش کر رہے تھے۔ سروں پر پروں کا تاج، کمر سے نیچے کھلی رنگین رسیوں کا قدیم تہہ بند، پاؤں اور باقی جسم برہنہ، چہروں اور پیٹ پر رنگین نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ افریقی جنگلیوں کا میک اپ تھا۔ ڈھول کی تھاپ پر پیروں کے ساتھ ساتھ جسم کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ دھوپ چمک رہی تھی۔ بدن پسینے میں شرابور تھے۔ مگر فنکار فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ تماش بین داد اور نقد انعام دے رہے تھے۔ مووی بن رہی تھی۔ ہجوم کے دوسری طرف شامیانے کے نیچے اسٹیج بنا تھا۔ دریاں اور قالین بچھے تھے۔ صوفے اور کرسیاں سجی تھیں۔ واجہ کریم داد کا انتظار ہو رہا تھا۔ واجہ صاحب تشریف لائے۔ رسمی تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہم باہر نکل آئے۔ یہاں وہی پرانے مناظر تھے۔ فرق صرف

یہ پڑا تھا کہ دونوں طرف کی ٹریفک روک دی گئی تھی۔ سڑکیں سنسان ہوگئی تھیں۔

تقریریں ختم ہوئیں۔ ریس کے آغاز کے آثار نمودار ہوئے۔ جاکی اور گدھے پُرجوش ہوگئے۔ پولیس والے چوکس اور فوٹوگرافرز تیار ہوئے۔ کسی غلط فہمی کی بنا پر باقاعدہ افتتاح سے پہلے ہی دس دس گاڑیوں پر مشتمل دو گروپوں میں ریس شروع کرادی گئی۔ انتظامیہ متحرک ہوئی قصور وار کو ناقابل اشاعت القابات سے نوازا گیا۔ تب واجہ کریم داد صاحب پنڈال سے باہر سڑک پر تشریف لائے۔ اور کبوتر چھوڑ کر اور غبارے پھوڑ کر ریس کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔

اس دوڑ میں پینسٹھ گاڑیوں نے حصہ لیا۔ دس دس گاڑیوں کے گروپ بنائے گئے تھے۔ اور ہر گروپ میں سے صرف اول آنے والے کو انعام کا حقدار قرار دیا جانا تھا۔ گدھا گاڑیوں کے آخری گروپ کے پیچھے پیچھے سارجنٹوں کا گروپ ہوٹر بجاتا ہوا روانہ ہوا۔ اور ٹریفک بحال کردی گئی۔ ہم نے جلدی سے ایک رکشا پکڑا اور اسے بتایا کہ ہمیں گدھوں کو پکڑنا ہے۔ ڈرائیور نے حیرت سے ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے تفصیل بتائی کہ ان گدھوں کو جو ریس میں حصہ لے رہے ہیں اور ابھی ابھی روانہ ہوئے ہیں۔ رکشا ڈرائیور نے کمال اطمینان سے سر ہلایا۔ جلدی سے رکشا اسٹارٹ کیا اور ایک مزدا کے پیچھے لگادیا۔ لیکن ہمارا رکشا ریس کے قابل نہیں تھا۔ اس لئے دوڑنے والا آخری گروپ بھی ہم سے پہلے کلفٹن پہنچ گیا۔

ہم کلفٹن پہنچے تو دور دور تک گدھے اور گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ریس کو ختم ہوئے خاصی دیر ہوچکی تھی۔ گدھوں کا پسینہ خشک ہوچکا تھا۔ البتہ بلوچی رقص کرنے والے ابھی تک ناچ ناچ کر پسینہ بہا رہے تھے۔ ایک طرف شامیانے اور قناتیں لگا کر تقریب کے لئے جگہ مخصوص کردی گئی تھی۔ پولیس والے لوگوں کو ان شامیانوں سے دور رکھنے کے لئے چوکس کھڑے تھے۔ ننھے منے اسکاؤٹ بھی یہاں ڈیوٹی دے رہے تھے۔ ہم نے صحافی ہونے کا فائدہ اٹھایا۔ شامیانے میں گھس کر اول آنے والے کھلاڑیوں سے ملے۔ ان کے تاثرات پوچھے' ظاہر ہے وہ خوش تھے۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ سرکاری تقریب کے تمام لوازمات موجود تھے۔ ہم وہاں سے نکل آئے کیونکہ ایسی سرکاری تقریبات ہمیشہ تاخیر سے شروع ہوتی ہیں۔ ہم ادھر چلے جہاں گدھا گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اکثر گاڑیاں خالی تھیں۔ تھکے ہوئے زخمی گدھے سر ڈالے کھڑے تھے۔ (گدھوں کو تیز بھگانے کے لئے جاکی ٹین کے ڈبے میں کنکر ڈال کر اسے بجاتے ہیں اور اس

سے گدھے کے کولہوں اور دُم پر چوٹ بھی لگاتے ہیں، جس سے وہ زخمی ہو جاتے ہیں)۔ سیر کے لئے کلفٹن آنے والے لوگ اتنے سارے گدھوں کو ایک ہی جگہ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ منچلوں نے ان پر جملے کسے، بعضوں نے دل لگی کی۔ گدھوں نے ان کی باتوں کا نوٹس نہیں لیا۔

ایک زخمی گدھے کے پاس چند اداس جاکی کھڑے تھے۔ کچھ وردیوں میں تھے۔ کچھ سادہ لباس میں۔ ایک صاحب استادانہ شان سے کھڑے تھے۔ ہم ان کے پاس چلے گئے اور کچھ ریس کے بارے میں ان کے تاثرات پوچھے۔ استاد صاحب بھرے بیٹھے تھے۔ ایک دم پھٹ پڑے۔ ریس کے انتظام اور انتظامیہ میں کیڑے نکالے۔ منصفین کو بے نقط سنائیں۔ اصول وقواعد کی خامیوں اور خلاف ورزیوں پر لیکچر دیا۔ جیتنے والوں کی جیت سے پردہ اٹھایا۔ اقربا پروری کا طعنہ دیا۔ دھاندلی کا شکوہ کیا۔ اور اپنے مطالبات کی لمبی فہرست ہمیں سنادی۔ اکثر لوگ استاد کے حامی نظر آتے تھے۔ غیر جانبدار لوگوں نے بھی استاد کی ہاں میں ہاں ملائی۔ گدھوں نے بھی خاموش حمایت کی۔ گدھے ہمیشہ خاموش حمایت کرتے ہیں۔ صرف احتجاج چلّا چلّا کر کرتے ہیں۔ محمد بن مالک نے کہا۔ "گدھوں سے بھی ان کے مطالبات معلوم کرنے چاہئیں۔ ہو سکتا ہے وہ چاہتے ہوں کہ گدھوں کی ریس کے منصف بھی گدھے ہوں تاکہ وہ سب کو ایک آنکھ سے دیکھ اور ایک ہی کُھر سے ہانک سکیں۔" مگر گدھوں کے مطالبات کون سنتا ہے۔ سب ادھر ادھر کی باتوں میں اڑا دیئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے بھی ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں۔ استاد سے پوچھا۔

"یہ گدھے عام دنوں میں کچھ کام بھی کرتے ہیں یا صرف آرام کرتے ہیں اور خاص خاص موقعوں پر بھاگتے ہیں؟"

"نہیں جی!" استاد نے ٹھنڈی سانس لی۔ "گدھوں کی قسمت میں آرام کہاں؟ سارا سال بوجھ ڈھوتے ہیں ..... میں دھوبی ہوں .....اور یہ دھوبی کا گدھا ہے۔"

"کھلاتے کیا ہیں اسے؟"

"عام دنوں میں وہ وہی کچھ کھلاتے ہیں جو سب کھاتے ہیں۔ البتہ دوڑ کے دن سے دس پندرہ روز پہلے اس کو کھڑا کر دیتے ہیں۔ پھر گاڑی میں نہیں چلاتے۔ ان دنوں میں اس کی خوراک بڑھ جاتی ہے۔ پستہ، بادام، کُشتے اور طاقت کی دوائیں کھلاتے ہیں۔ دوڑ کی پریکٹس کراتے ہیں۔ اس سڑک اور راستے سے اس کی جان پہچان کرا دیتے ہیں جہاں دوڑ ہونی ہوتی ہے۔ مالش بھی کرتے ہیں۔ بڑی محنت ہوتی ہے جی، خوب

خدمت کرنی پڑتی ہے۔"

ہم نے رشک بھری نظروں سے گدھے کو دیکھا۔ "کیا وی آئی پی ٹریٹمنٹ ہے"! مگر گدھے نے سر جھٹک کر اور دم سے مکھی اڑا کر اپنی بے زاری کا اظہار کردیا۔ وہ کچھ دیر پہلے وی آئی پی بننے کا حشر دیکھ چکا تھا۔ وہ تو شاید امن کا سفیر بننے پر بھی پچھتا رہا تھا۔ خیر پچھتانا تو گدھوں کا کام ہے لیکن پچھتانے یا آنسو بہانے سے گیا وقت تو واپس نہیں آسکتا تھا۔ ہم نے روتی صورتوں کو چھوڑا اور مسکراتے چہروں کی طرف چل پڑے۔ دوڑ میں جیتنے والے ابھی تک چمک رہے تھے۔ ان کے چہرے دمک رہے تھے۔ لیکن ہمیں مسرت کی اس چمک میں ایک اور رنگ نظر آرہا تھا۔ غفلت کا رنگ۔ کیونکہ ہم ان کی جیت کے اصل راز سے واقف ہوچکے تھے۔ ہم امن کے سفیروں کا حال دیکھ چکے تھے اور مشیروں کا حال دیکھ رہے تھے۔

سفیر تو خیر گدھے تھے ..... لیکن ان مشیروں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جو بے ایمانی اور جھوٹ کے ذریعے امن قائم ہوجانے کی اُمید پر پنڈال میں اچھل رہے تھے۔

ہوا یوں کہ

ہر انسان کی زندگی مختلف نوعیت کے واقعات سے بھری ہوتی ہے۔ کچھ واقعات خوشی بخشنے والے ہوتے ہیں کچھ دکھ دینے والے، کچھ حیران کن ہیں کچھ مضحکہ خیز۔ یقیناً آپ کے زندگی میں بھی کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا ہوگا جب آپ خوشی سے پھولے نہیں سمائے ہوں گے یا غم سے آنسو نکل پڑے ہوں گے۔ کوئی ایسا واقعہ جب حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہوں یا خوف سے رونگٹے کھڑے ہوگئے ہوں یا ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے ہوں اگر ایسا کوئی واقعہ آپ کے ساتھ پیش آیا ہو تو ہمیں لکھ بھیجئے۔ ہم اسے آنکھ مچولی میں آپ کے نام اور تصویر کے ساتھ شائع کردیں گے۔ لیکن دھیان رہے کہ واقعہ آپ کا ذاتی اور بالکل سچا ہو۔ اور زیادہ سے زیادہ دو فل اسکیپ صفحات تک طویل ہو۔ بہترین واقعہ بھیجنے والے کو خوب صورت تحفہ بھی ارسال کیا جائے گا۔

پتا: انچارج مقابلہ ہوا یوں کہ ... ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی

عبدالقادر

میں ایک نوجوان ہوں

پوچھو نہ حال میرا، میں سر پھرا جواں ہوں
دنیا سے ہوں نرالا، میں سر پھرا جواں ہوں

اپنے معاشرے میں ہر سمت گندگی ہے — میں جی رہا ہوں لیکن بے کار زندگی ہے
انسانیت کہاں ہے، ساری درندگی ہے — ظلم و درندگی کا کیا نام بندگی ہے؟

جتنی برائیاں ہیں، میں اُن کا راز داں ہوں
کوئی نہ مجھ سے بولے، میں سر پھرا جواں ہوں

کوئی ملازمت بھی مجھ کو نہ مل سکی ہے — فریاد افسروں نے میری نہیں سنی ہے
ہاتھوں میں اب تو میں نے بندوق تھام لی ہے — ڈگری جو کی تھی حاصل، چولھے میں جھونک دی ہے

دکھ درد میں نے جھیلے، میں غم کی داستاں ہوں
مجھ سے نہ کوئی الجھے، میں سر پھرا جواں ہوں

ظالم سماج کی میں آغوش میں پلا ہوں — کھا کھا کے تازیانے میں آج دل جلا ہوں
شیطان مجھ کو سمجھو یا میں بُری بلا ہوں — طوفان بن کے گھر سے میدان میں چلا ہوں

منزل نہیں ہے جس کی، میں ایسا کارواں ہوں
کوئی مجھے نہ چھیڑے، میں سرپھرا جواں ہوں

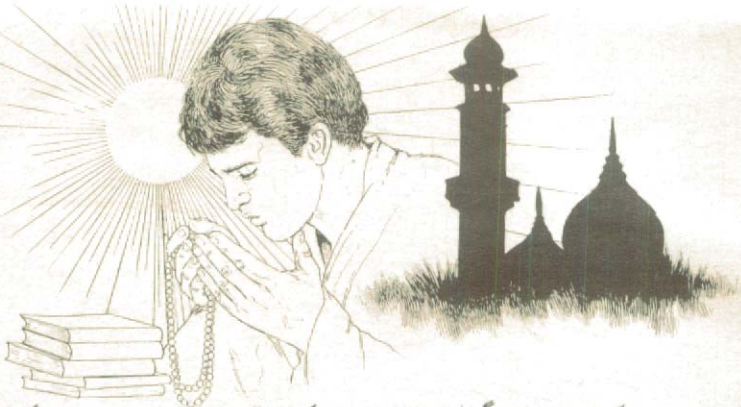

رستہ جو میرا روکے، اس کا جگر چباؤں جو بھی قریب آئے، اس کا گلا دباؤں
سارے ہی سرکشوں کے سر خاک میں ملاؤں سکّہ بہادری کا دنیا پہ میں بٹھاؤں
ہر گز نہ یہ سمجھنا میں تیس مار خاں ہوں
کوئی نہ پاس آئے، میں سر پھرا جواں ہوں

ظالم سماج کا میں تکّیہ نظام کردوں غارت گری سے سب کا جینا حرام کردوں
مغرور ہستیوں کو اپنا غلام کردوں میں دشمنوں کا قصہ پل میں تمام کردوں
جو باغ کو اجاڑے، وہ موسمِ خزاں ہوں
رستہ نہ کوئی روکے، میں سر پھرا جواں ہوں

اب میرے دل میں لوگو ایسا خیال آیا بھائی ہیں سب مسلماں، کوئی نہیں پرایا
جو راستہ نبیؐ نے انسان کو بتایا اس راہ سے کروں گا میں ظلم کا صفایا
مجھ سے نہ خوف کھاؤ، میں امن کا نشاں ہوں
میرے قریب آؤ، میں نیک دل جواں ہوں

پارہ جو چڑھ گیا تھا، اک دَم اتر گیا ہے جوش و غضب کا طوفاں جانے کدھر گیا ہے
غصے کا میرے دل سے سارا اثر گیا ہے رحم و کرم کا جذبہ سینے میں بھر گیا ہے
تسکین ہوں دلوں کی، میں ایک سائباں ہوں
میں سب پہ مہرباں ہوں، میں نیک دل جواں ہوں

وہ شاخ ہی نہ رہی

محمد ظریف

میں کراچی کے ایک مقامی کیڈٹ کالج میں استاد ہوں۔اب استاد تو "استاد" ہوتا ہے۔خواہ وہ کسی اسکول میں ٹیچر ہو، کالج میں لیکچرار یا یونیورسٹی کا پروفیسر۔ اور صاحبو۔ ہر بس یا منی بس میں ایک "استاد" ہوتا ہے جسے زور سے پکار کر کنڈیکٹر کہتا ہے۔

"استاد! جانے دو، چھتی بونجہ (3652) آئی ہے۔" خیر بات یہ تو تفننِ طبع کے لئے تھی۔

بہرحال میں اب اپنی تدریسی زندگی کے بیسویں برس میں ہوں اور اب تک اندرون و بیرون ملک تعلیمی اداروں میں بھانت بھانت کے طلبہ وطالبات سے واسطہ پڑا ہے مگر کیڈٹ کالج کا تجربہ نرالا ہی رہا ہے۔

شائد آپ کیڈٹ کالج کے مخصوص تدریسی و تربیتی طریقۂ کار سے واقف ہوں۔ تاہم جنہیں اس کا علم نہیں ان کی معلومات کے لئے عرض ہے

کہ کیڈٹ کالج ایک مخصوص نوعیت کا تعلیمی ادارہ ہوتا ہے جہاں طلبہ کو نصاب پڑھانے کے ساتھ ساتھ فوجی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ انہیں زندگی گزارنے کے ادب آداب بھی سکھائے جاتے ہیں۔ طلبہ چوبیس گھنٹے کالج میں اس لئے رہتے ہیں کہ یہ ایک اقامتی ادارہ ہوتا ہے۔ کیڈٹ کالج کے طلبہ ایک سخت ڈسپلن میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں، پی ٹی پریڈ اور ورزش کرتے ہیں۔ الغرض ان کا سونا جاگنا، کھانا پینا، عبادت کرنا اور تفریحی مشاغل میں حصہ لینا ایک مخصوص ضابطے کے مطابق ہوتا ہے۔

کیڈٹ کالج کا ہر لیکچرار اور پروفیسر خواہ وہ کسی مضمون کا معلم ہو اس بات کا پابند ہے کہ تدریسی معمولات کے علاوہ کالج کے نظم وضبط میں بھی کالج کی انتظامیہ کا ہاتھ بٹائے۔ انتظامی اور تربیتی امور کی نگرانی کرنے کے لئے پاکستان کی مسلح افواج کی جانب سے بھی کالج میں افسران اور جوان متعین کئے جاتے ہیں۔ فی الوقت ہمارے کالج میں کیپٹن رینک کا ایک افسر ایڈجوائنٹ کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ پانچ عدد نان کمیشنڈ افسران بھی ہیں۔

یہ سب انتظام تو ایک طرف، مگر ان سب سے زیادہ ایک اور ہستی کالج کے انتظامات اور دیکھ بھال کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اور وہ ہے ڈیوٹی آفیسر۔ مگر یہ نہ سمجھئے کہ ڈیوٹی آفیسر کوئی مستقل عہدہ ہوتا ہے۔ کالج کا ہر استاد باری باری ایک دن یعنی چوبیس گھنٹے کے لئے اس حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ ڈیوٹی آفیسر کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت چوکنا رہے اور کالج کے نظام الاوقات پر عمل درآمد کو یقینی بنائے۔ اس کی معاونت کے لئے چار اساتذہ کرام اور بھی ہوتے ہیں جنہیں "ہاؤس افسران" کہا جاتا ہے۔ مگر یہ چاروں افسران شب ساڑھے دس بجے تک اپنی ڈیوٹی انجام دے کر رخصت ہو جاتے ہیں اور اگلی صبح ناشتے تک کے لئے "کروڑوں روپیہ کا کالج" ڈیوٹی آفیسر کی تحویل میں رہتا ہے۔

طلبہ کے لئے لازمی ہے کہ شب گیارہ بجے تک اپنے بستروں پر چلے جائیں۔ ڈیوٹی آفیسر کا فرض ہے کہ وہ اپنی موجودگی میں تمام بتیاں گل کرائے اور گیارہ بجے کے بعد کسی کیڈٹ کو کمرے سے باہر نہ آنے دے۔ مگر کیڈٹ لاکھ منظم زندگی گزاریں مگر پھر بھی کوئی نہ کوئی ایسی شرارت کر بیٹھتے ہیں جس سے غصہ بھی آتا ہے اور ہنسی بھی۔ تو صاحبو! اپنی ڈیوٹی افسری کے دوران ایک دن احقر کو ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

تو ہوا یوں کہ دن بھر کے معمولات کے بعد

حسبِ معمول شب گیارہ بجے میں نے بتیاں گل کرائیں اور کالج کا ایک چکر لگایا۔ جن کمروں میں کیڈٹ جاگتے' شور مچاتے یا کھسر پھسر کرتے نظر آئے انہیں سوجانے کی ہدایت کی اور جو لڑکے بلا مقصد اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے انہیں سختی کے ساتھ سرزنش کی اور کمروں میں چلے جانے کا حکم دیا۔ یہ تمام انتظامات مکمل کرکے میں اطمینان کے ساتھ اس کمرے میں چلا گیا جسے "ڈیوٹی آفیسر روم" کہا جاتا ہے۔ جہاں ڈیوٹی آفیسر شب بسری یا "شب بیداری" کرتا ہے۔ کیونکہ ڈیوٹی افسری کی ذمہ داریاں اسے سکون کے ساتھ سونے نہیں دیتیں۔

کوئی ایک بجے شب تک ہی میں کمرے میں بستر پر لیٹا ایک رسالہ پڑھتا رہا۔ مجھے اچھی طرح تو یاد نہیں البتہ کچھ اندازہ ہے کہ کوئی ڈیڑھ بجے شب کے قریب مجھے کچھ نیند سی آگئی۔ لیکن ابھی غنودگی کے عالم میں مجھے کوئی پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اچانک ڈیوٹی روم کے باہر سے کچھ لڑکوں کے قہقہے لگانے' شور مچانے اور دوڑنے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ "یا خدا! خیر" کیا ہوا میں بستر سے اٹھا اور دروازے کی طرف دوڑا۔ کنڈی کھول کر دیکھا تو صرف چند گز کے فاصلے پر کچھ لڑکے کھیلتے دکھائی دیئے۔ چونکہ میں چشمہ لگاتا ہوں اور اس وقت عینک میری آنکھوں پر نہ تھی۔ اسی لئے میں ان کیڈٹس کے چہرے صاف طور پر تو نہ دیکھ سکا مگر اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ وہ بڑی کلاسوں کے لڑکے تھے جو کیڈٹ کالج کی اصطلاح میں سینئرز کہلاتے ہیں۔ میں نے دروازے پر ہی کھڑے کھڑے انہیں سختی کے ساتھ ڈانٹا اور اپنے پاس آنے کا حکم دیا۔ مگر وہ لوگ گیند بلا لے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں ان لوگوں کے پیچھے دوڑا۔ ابھی یہ بھاگ دوڑ جاری ہی تھی کہ جس واحد بلے سے وہ لوگ کھیل رہے تھے وہ بلا باز کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ میں جیسے ہی اس بلے کو اٹھانے کے لئے جھکا وہ لوگ میری دسترس سے دور چلے گئے پلک جھپکتے ہی وہ اپنے کمروں میں گھس کر بستروں میں دُبک گئے۔ کمروں کی کنڈیاں چڑھادیں اور ان کے مصنوعی خراٹے گونجنے لگے۔

اس وقت غصے سے میرا خون کھول رہا تھا۔ "غضب خدا کا' میرے ہی سینے پر مونگ دلا جارہا تھا۔ یعنی کمبختوں نے ڈیوٹی آفیسر روم کے سامنے والے لان ہی کو لارڈز کا میدان بنادیا۔" میں نے سوچا اور پھر بلا ہاتھوں میں لے کر ایک کمرے میں جاکر سوتوں کو جگاتا اور سب کو سخت سست کہہ کر دریافت کرتا رہا کہ کرکٹ کون کون کھیل رہا تھا' بلا کس کا ہے' گیند کس کے پاس ہے؟ مگر صاحب بڑے "منظم" اور ڈھیٹ کیڈٹ تھے کسی

نے بھی کچھ نہ بتایا۔ میں نے غصے میں اس بیٹ کو توڑنے کی کوشش کی مگر وہ بلا بھی انہی لڑکوں کی طرح ہٹ دھرم تھا اس نے ٹوٹ کر نہ دیا۔ تب مجھے خیال آیا کہ اگلی صبح یہ بیٹ بطور ثبوت پرنسپل صاحب اور ایڈ جوائنٹ کے روبرو پیش کروں گا۔ وہ اس کی مدد سے خود ہی مجرمین کو تلاش کریں گے۔ لہٰذا ان لڑکوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر بلا اپنے ساتھ لئے میں ڈیوٹی روم میں واپس آیا اور بستر پر دراز ہوگیا۔

کیڈٹ کو سرزنش کرنے اور ان سے پوچھ گچھ میں تقریباً" دو گھنٹے صرف ہوئے تھے۔ اور اس وقت رات کے کوئی ساڑھے تین بج رہے تھے۔ بستر پر لیٹتے ہی پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا اور میں بے غل و غش سوگیا۔ صبح سات بجے جب میری آنکھ کھلی تو سب سے پہلے میری نظر اپنے بستر کے برابر والی دیوار پر پڑی۔ جہاں گزشتہ رات میں نے "جرم کے ثبوت" یعنی اس بلے کو لٹکایا تھا مگر وہ تو اپنی جگہ سے اس طرح غائب تھا جیسے "گھوڑے کے سر سے سینگ" (خدا جانے اس اصل محاورے میں گدھے کا حوالہ دیا کیوں دیا جاتا تھا حالانکہ سینگ تو گھوڑے کے بھی نہیں ہوتے) اس ثبوت کو اس طرح رفو چکر دیکھ کر میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ "قہر درویش پر جان درویش۔"

دراصل ہوا یہ تھا کہ جب میں بلے کو لے کر کمرے میں داخل ہوا تو بستر پر لیٹنے سے قبل دروازے کی کنڈی لگانا بھول گیا تھا۔ ادھر میری غفلت سے فائدہ اٹھا کر رات بھر جاگنے والا کوئی چمگادڑ بچہ آیا اور بلا اٹھا کر چنپت ہوگیا۔ اب چونکہ میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا اس لئے میں نے بات بڑھانا یا پرنسپل اور ایڈ جوائنٹ سے شکایت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن اس واقعہ سے مجھے اچھا سبق مل گیا اور اب سونے سے پہلے ڈیوٹی روم کی کنڈی ضرور چڑھا لیتا ہوں۔ مگر یہ سوچ کر آج تک ہنسی آتی ہے کہ ظالموں نے ثبوت کو واقعی بڑی خوبصورتی سے مٹادیا۔ یعنی

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

لوہا خور آدمی

یوگوسلاویہ کے ایک سرکس میں ایک ایسا آدمی ہے جو لوہا کھاتا ہے۔ وہ شخص اب تک ۲۲۵۰۰ ریزر بلیڈ، ایک ٹن پیتل کا سامان، چھری، کانٹے اور چھوٹے موٹے فاضل پرزے کھا چکا ہے۔ اب خبر ملی ہے کہ اس نے ایک پرانی بس خریدی ہے جو وہ دو سال میں کھانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

مرسلہ: خورشید انور

دیوار کے مکان

فوزانہ روحی

"میں فیصلہ کرچکا ہوں۔ اب اس محلے میں رہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ تم سب بھی کوشش کرو کہیں کوئی دوسرا اچھا مکان مل جائے۔" پرویز صاحب نے ایک طرح سے سب کو آرڈر دیا۔

"مگر ابو اب یہاں رہنا مناسب کیوں نہیں جبکہ ہمارا سارا بچپن یہیں گزر گیا ہے۔ تو اب کیا ہے؟" طارق کو ابو سے اختلاف تھا۔

"تب اور بات تھی اور اب وقت بہت بدل گیا ہے۔ سارے پرانے محلے دار یہاں سے اپنے مکان فروخت کرکے جاچکے ہیں۔ یہ اب میرا پرانا محلہ نہیں رہا۔ بلکہ کمرشل علاقہ ہوچکا ہے۔ وہ تم نے دیکھا نہیں رفیق صاحب نے اپنے چار سو گز کے مکان کو کسی قالین والے کے ہاتھوں بیچ دیا اور خود کسی بہترین علاقے کے فلیٹ میں شفٹ ہوگئے ہیں۔ سنا ہے وہ ان کے مکان میں اب

قالین کا کارخانہ لگائے گا۔ جبکہ پچھلے مہینے سبحانی صاحب کے مکان میں جوتے کا کارخانہ کھل گیا ہے۔ جہاں سے رات گئے تک جوتوں کے ٹھونک پیٹ کی آواز آتی رہتی ہیں۔" "ہاں ابو---- وہ سلطان انکل کے نئے کرایہ دار پتہ نہیں کیسے لوگ ہیں۔ اب تک معلوم نہیں ہوسکا کہ کہاں سے آئے ہیں اور کون لوگ ہیں۔ طرح طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ابھی تک ان کی آس پاس کے لوگوں سے دوستی بھی نہیں ہوئی۔ پڑوس کی زبیدہ آنٹی کہہ رہی تھیں مشکوک لوگ لگتے ہیں۔" مریم نے ابو کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"تو اس میں ہمارا کیا نقصان ہے۔ اچھا ہے لوگوں کے آنے جانے سے محلے میں رونق رہے گی۔" خالد بھائی بول پڑے۔

"پہلے کب محلہ ویران رہتا تھا۔ میں تو کہتی ہوں ابو اس گھر کو جلدی سے بیچ دیں۔ اور کوئی اچھا سا گھر خرید لیں۔ دیکھیں کتنا پرانا ہوگیا ہے۔" ثوبی نے دیواروں پر ایک نظر دوڑاتے ہوئے اکھڑے پلستر کی جانب دیکھ کر کہا۔ "پچیس سال پرانا گھر ہے۔ اب تو بالکل کھنڈر لگتا ہے۔"

طارق بولا۔ "ایسا کرو تم دونوں بہنیں یہاں سے چلی جاؤ۔ میں اور بھائی یہیں رہیں گے۔"

"جی نہیں۔ جہاں ہم جائیں گے آپ کو بھی وہیں جانا پڑے گا۔" مریم کے کہنے پر طارق اس گھر کے فائدے گنوانے لگا۔ "اس علاقے میں ہمارے سارے دوست رہتے ہیں۔ ویسے بھی یہاں جیسی سہولیات کہیں اور نہیں ملیں گی۔ بازار قریب ہے' بس اسٹاپ سامنے ہے اسکول کالج' اسپتال' ڈاک خانہ' مسجد غرض کہ تمام ضروریات فوراً پوری ہوجاتی ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹل بھی ہیں اچانک مہمان آجائے تو پکا پکایا کھانا بھی فوری دستیاب ہوجاتا ہے۔"

"اور---- اور بھائی قبرستان بھی قریب ہے۔" چھوٹے آصف نے ایک اور فائدہ گنوایا۔

"ہاں--- اس کی بھی آسانی ہے۔ مرنے کے بعد سفر آخرت جلد طے ہوجائے گا۔ اس لئے میں اس مکان کو بیچنے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ کچھ پیسے خرچ کر کے اس مکان کی مرمت کروالیں۔"

اس بار امی نے مشورہ دیا۔

"یہ بھی ممکن نہیں ہے کیوں کہ اس کی مرمت میں اخراجات بہت زیادہ اٹھیں گے اس سے بہتر ہے کہ بنا بنایا مکان خرید لیا جائے۔"

پورے گیارہ ماہ ہوچکے تھے' اس بحث مباحثے کو۔ گھر میں دو گروپ بن گئے تھے۔ خالد'

طارق اور امی ایک طرف تھیں جبکہ دوسرا گروپ ابو، مریم اور ثوبی پر مشتمل تھا۔ سب سے چھوٹے آصف کو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ اس مکان میں رہا جائے یا نیا مکان لیا جائے، اپنی سمجھ کے مطابق وہ دونوں پارٹیوں کی ہاں میں ہاں ملاتا جاتا۔

طارق اور خالد تو اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔ اس معاملے میں ان کے دوست بھی ان کے ہم خیال تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ علاقہ اور گھر چھوڑ کر تم لوگ نقصان میں رہو گے۔ یہ جگہ بہت اچھی ہے۔

جب بھی کوئی مکان کا خریدار مکان دیکھنے آتا تو طارق یا خالد اسے بہکا دیتے۔ خریدار پوچھتا کہ آپ لوگ یہ گھر کیوں بیچنا چاہتے ہیں تو اسے کہہ دیا جاتا "چونکہ اس گھر کی چھت بارش میں بُری طرح ٹپکتی ہے۔ اس کی مرمت پر کافی خرچہ آئے گا پھر یہ محلے دار ٹھیک نہیں ہیں۔" اس طرح کی باتیں سن کر متوقع خریدار دوبارہ پلٹ کر ہی نہیں آتا۔ یوں دونوں خوش ہو جاتے۔

اسی ہاں اور ناں کے درمیان مکان کا معاملہ لٹکا ہوا تھا۔ پرویز صاحب چاہتے تھے کہ یہ مکان بِکے تو نئے مالک سے چند ہفتوں کی مہلت لے کر انہی پیسوں سے نیا مکان خرید لیا جائے۔ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بہت سے مکانات ان کی نظر میں تھے۔

رات دن کا چکر تیزی سے طے ہوتا جا رہا تھا۔ مگر مکان کا معاملہ ابھی تک طے نہیں ہو پایا تھا۔ ایسے میں آصف کہتا "نہ ابو گروپ کی آرزو پوری ہوگی نہ امی پارٹی کی خواہش پوری ہوگی بلکہ اللہ میاں جو چاہیں گے وہی ہوگا۔"

ایک دفعہ کچھ ایسا واقعہ پیش آیا کہ سب کے سب گھر بیچنے پر متفق ہو گئے۔ ہوا یوں کہ ایک شب پرویز صاحب کے گھر کے پیچھے والے مکان میں جہاں مشکوک لوگوں کا آنا جانا تھا۔ پولیس نے چھاپہ مارا تو وہاں موجود افراد فرار ہونے کے لئے پرویز صاحب کے گھر میں کود گئے۔ اور وہاں سے فائرنگ کرتے ہوئے دوسرے گھروں کی چھتوں سے ہوتے ہوئے کہیں روپوش ہو گئے۔ جاتے ہوئے ایک ریوالور بھی وہیں پھینک گئے۔ ان افراد اور اسلحہ کی تلاش کے لئے پولیس ان کے گھر میں بھی داخل ہوئی اور سارا گھر الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ پرویز صاحب کو تفتیش کے لئے پولیس اپنے ساتھ لے گئی۔ گو کہ وہ ایک گھنٹے بعد ہی واپس آ گئے۔ مگر ان لوگوں کا پہلے کبھی پولیس تھانے سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس لئے سب بے حد خوف زدہ تھے۔

اس سے پہلے کہ اس طرح کا کوئی اور واقعہ ہوتا وہ سب جلد از جلد مکان فروخت کرنے پر تُل گئے۔ چونکہ اتفاق میں برکت ہوتی ہے۔ اسی لئے مکان بھی جلد مناسب داموں بک گیا اور دوسرے ہفتے ہی نیا مکان خرید لیا گیا۔ ثوبی، مریم نئے گھر میں آکر بہت خوش تھیں۔ اور اپنی سہیلیوں کی دعوت کا پروگرام بنا رہی تھیں۔ نئے گھر میں آئے ہوئے دو مہینے ہو چکے تھے۔ مگر خالد طارق اور امی ابھی تک پرانے مکان کو یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے۔ طارق بھائی تو کچھ زیادہ ہی اداس رہنے لگے تھے۔ کیونکہ انہیں میڈیکل کالج میں داخلہ نہیں مل سکا تھا۔ آرمی جوائن کرنے کی خواہش بھی تشنہ رہی کیونکہ وہ فزیکل ٹیسٹ میں ناکام ہوگئے۔ طارق نے تمام ناکامیوں کی وجہ نئے گھر کو قرار دیا۔ جب خالد کی موٹر سائیکل چوری ہوئی تو اس نے کھل کر کہنا شروع کر دیا کہ "یہ گھر منحوس ہے۔" امی بھی بیمار رہنے لگی تھیں۔ سب کا خیال تھا کہ نیا گھر انہیں راس نہیں آیا۔ کوئی بڑا نقصان اٹھانے کی بجائے یہ گھر چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔

پرویز صاحب اس طرح کی باتیں سن کر سخت ناراض ہوتے۔ ان کا کہنا تھا کہ طارق کی میڈیکل کالج و آرمی میں داخلے کی ناکامی، امی کی بیماری اور خالد کی موٹر سائیکل کی گم شدگی کا نئے مکان سے کوئی تعلق نہیں۔ سب پرانے مکان سے شروع کئے ہوئے کام ہیں۔ نئے مکان میں شفٹ ہونے سے پہلے ہی طارق نے انٹر کا امتحان دیا تھا۔ جس کا رزلٹ نئے مکان میں آکر اپنے وقت پر آیا۔ اس نے جیسا امتحان دیا ویسا ہی نتیجہ اپنے مقررہ وقت پر نکلا۔ خالد کی موٹر سائیکل اس لئے چوری ہوئی کہ آج کل ایسی وارداتیں بہت ہونے لگی ہیں۔ روزانہ بے شمار افراد نشانہ بن کر اپنی گاڑیوں سے ہاتھ دھوتے ہیں۔ اور تمہاری امی کو جوڑوں کا درد برسوں سے لاحق ہے۔ اب وہ بد پرہیزی اور بے احتیاطی سے مسلسل بیمار رہنے لگی ہیں۔ تم لوگوں نے اس گھر کو دل سے قبول نہیں کیا ہے۔ اس لئے اپنی اپنی کوتاہیاں اس نئے مکان سے منسوب کر رہے ہو۔ میں، ثومی، آصف اور مریم بھی تو اسی گھر میں رہتے ہیں ہمیں تو کچھ نہیں ہوا۔۔۔ جس دن تم سب نئے گھر کو ذہنی و قلبی طور پر قبول کر لو گے یہ گھر تمہیں منحوس نہیں لگے گا۔" ابو نے.... کچھ توقف کرنے کے بعد مزید کہا۔ "یہ در و دیوار یہاں کی اینٹ پتھر سب جمادات ہیں۔ پیڑ پودے نباتات ہیں۔ یہ بھی ہماری طرح اللہ کی مخلوق ہیں۔ یہ بول نہیں سکتے، چل پھر نہیں سکتے مگر سب

کچھ سنتے اور سمجھتے ہیں۔"

"تو ابو..... میں جب اس مکان کو منحوس کہتا ہوں تو دیواریں سب سنتی ہوں گی اور برا مانتی ہوں گی!" طارق بھائی نے ابو کی باتیں سن کر سوال پوچھا تو وہ بولے'

"نہیں بیٹا۔ بُرا صرف انسان مانتا ہے۔ یہ درخت' پھول' پودے' اینٹ' پتھر انسان کی غلط حرکتوں اور غلط باتوں کا بُرا نہیں مانتے انہیں اللہ نے انسان کی بھلائی اور خدمت کا فرض سونپا ہے۔ یہ جمادات چپ چاپ تکلیفیں اٹھا کر اپنا فرض نبھائے جاتے ہیں۔ اگر ان کی قدر کی جائے' انہیں اہمیت دی جائے تو یہ خوش ہو کر انسان کے لئے دعا کرتے ہیں۔"

ابو کی گفتگو ختم ہو چکی تھی۔ سب کے چہروں پر سنجیدگی چھائی تھی۔ لگ رہا تھا کہ ان کی باتوں کا سبھی نے خاطر خواہ اثر لیا ہے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد خالد نے گھر پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ "گھر تو بہت اچھا ہے۔ مگر پچھلی دیوار کچھ کمزور لگتی ہے اس لئے گر سکتی ہے۔"

آصف جھٹ بولا۔ "اوں..... بھائی جان بُری بات' مکان کے کسی حصے کو برا نہ کہیں دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اگر اس نے سن لیا تو صدمے سے ابھی گر پڑے گی۔"

آصف کی بات سن کر سب کے قہقہے چھوٹ گئے۔

آٹو گراف

(۱) ہر مشکل انسان کا امتحان لینے آتی ہے۔

(۲) ہر کامیابی مسلسل جدوجہد اور متواتر لگن کا نتیجہ ہوتی ہے۔

(۳) علم سے انکسار' دولت سے غرور پیدا ہوتا ہے۔

(۴) برے لوگ زہریلے سانپ کی طرح ہیں جہاں تک ہو سکے ان سے بچو۔

(۵) کم بولنے میں حکمت' کم کھانے میں صحت' کم ملنے میں عافیت ہے۔

(۶) ہر شے کا ایک حسن ہوتا ہے اور نیکی کا حسن یہ ہے کہ فوراً" کی جائے۔

(۷) قوت سے بڑھ کر کوئی چیز سچی اور امید سے بڑھ کر کوئی چیز جھوٹی نہیں۔

(۸) مہمان کے لئے زیادہ خرچ کرنا اسراف نہیں ہے۔

(۹) قناعت سب سے بڑی دولت ہے۔

(۱۰) اگر دنیا کے درخت قلم بن جائیں اور سمندر کا پانی سیاہی جب بھی انسان خدا کی نعمتیں نہیں گن سکتا۔

نورا ریسلنگ

قرۃ العین طاہر

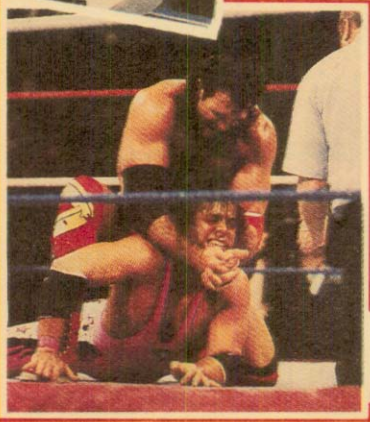

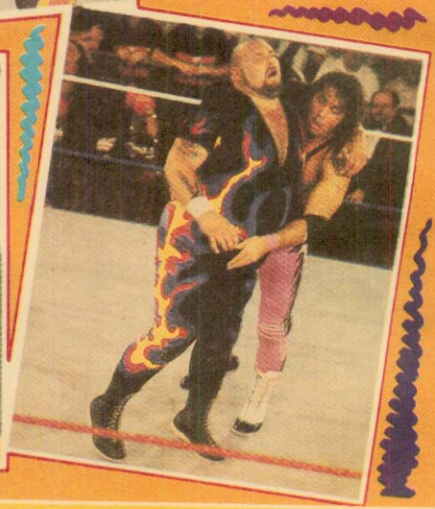

ریسلنگ کی فلم ہر ہفتے کو ٹیلی ویژن پر آتی ہے۔ یہ فلمیں بڑے مزے کی ہوتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ پہلوانوں میں پہلے سے معاہدہ ہو چکا ہے کہ پہلے چند منٹ تک تم دل بھر کر میری پٹائی کرنا پھر میں تمہاری پٹائی کروں گا۔ اور یہ پٹائی مُکّے بازی، فلائنگ کک وغیرہ سب کی سب مجلی ہوں گی۔ ہمارے ملک میں اس قسم کی لڑائی کو "نورا کشتی" کہتے ہیں۔ لیکن یہ ریسلنگ تو نورا کشتی سے بھی بڑھ کر ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر ایک کمزور آدمی پوری قوت سے کسی طاقت ور آدمی کے پیٹ میں لات مارنے یا منھ پر مکّا رسید کرنے تو طاقت ور آدمی کے لئے اٹھنا محال ہو جاتا ہے لیکن اس قسم کی ریسلنگ میں ایک پہلوان کافی دیر تک دوسرے پہلوان کا مار مار کر بھرکس نکال دیتا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد ہی مار کھانے والے پہلوان میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آجاتی ہے کہ وہ مارنے والے پہلوان پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اور باری باری ایک دوسرے کو زدوکوب کرنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ ریفری کسی ایک پہلوان کا ہاتھ اٹھا کر اسے فاتح قرار دے دیتا ہے۔ غالباً یہ بھی پہلے سے طے ہوتا ہوگا اور ہارنے والا پہلوان ہارنے کے عوض خاصی بڑی رقم وصول کرتا ہوگا۔ خیر جو کچھ بھی ہو لیکن یہ نورا کشتی بھی بڑی دل چسپ ہوتی ہے۔ لڑنے بھڑنے کے شوق کو اس سے بڑی تسکین ملتی ہے۔ اسی لئے بچے اور بڑے سب ہی ریسلنگ کی فلم کو بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔

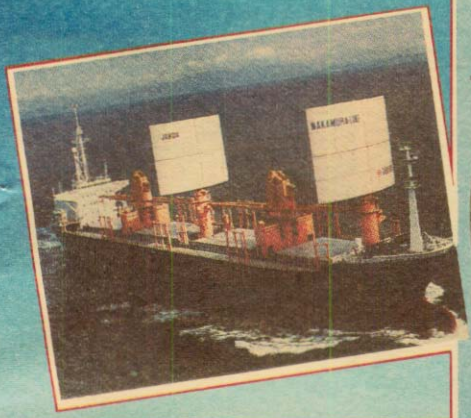

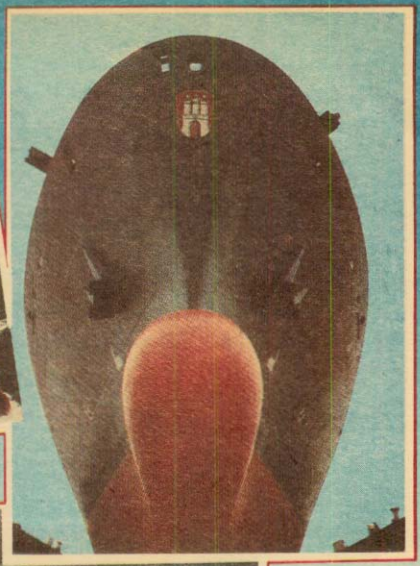

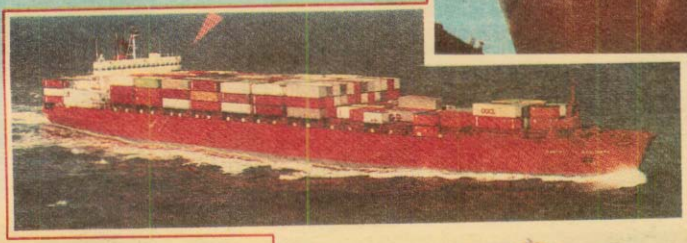

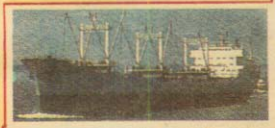

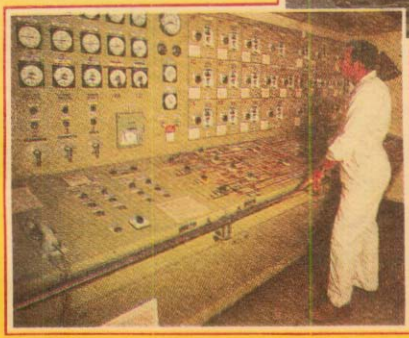

ریحانہ منیر

تیرتے جہاز

اتنے بھاری بھاری جہاز سمندر میں کیسے تیرتے ہیں؟ جبکہ ایک ہلکی پھلکی، ننھی مُنی سی سوئی جھٹ پٹ ڈوب جاتی ہے۔ اکثر بچوں کے ذہن میں آج بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور آج سے دو سو سال پہلے جب یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اب کشتیاں لوہے کی بنیں گی، تو اس وقت کے لوگوں نے بھی اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے، لوہا، لکڑی سے بہت بھاری ہوتا ہے وہ تو فوراً ڈوب جائے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ لوہے کی کشتیاں بنیں اور کامیابی سے لہروں پر تیرتی رہیں۔ بعد میں اسٹیل کی کشتیاں اور بڑے بڑے جہاز سمندر کے سینے پر دندناتے دیکھے گئے۔ یہ سب کیسے ممکن ہوا۔ آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔

دراصل کشتی یا جہاز کے تیرنے کی صلاحیت کا تعلق اس کے وزن اور حجم کے تناسب سے ہوتا ہے۔ اہم بات یہ نہیں ہے کہ کشتی کتنی وزنی ہے بلکہ یہ کہ اس کا حجم کتنا ہے۔ اگر حجم کافی ہے تو کشتی ضرور تیرے گی۔

جب کوئی جسم پانی میں رکھا جاتا ہے تو اس کے نیچے سے پانی کی ایک خاص مقدار یا حجم اطراف میں منتقل ہوجاتا ہے لیکن چونکہ پانی اپنی سطح برابر رکھتا ہے لہٰذا اطراف کے پانی پر دباؤ کی وجہ سے ردِ عمل کے طور پر پانی میں اچھال کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اب اگر پانی میں اتارے گئے جسم کے حجم مناسب ہے تو یہ اچھال کی قوت اسے ڈوبنے سے بچالے گی۔ اور اگر حجم وزن سے کم ہے تو چیز ڈوب جائے گی۔ اچھال کی قوت ہمیشہ پانی کے اس حجم کے برابر ہوتی ہے جو پانی میں اتارے گئے جسم کے وزن کی وجہ سے اطراف میں منتقل ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سوئی یا لوہے کی ایک بڑی سلاخ بھی پانی میں ڈوب جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے وزن سے ہٹنے والے پانی کا حجم اس کے وزن سے بہت کم ہوتا ہے۔ لہٰذا اچھال کی قوت بھی بہت کم پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب ایک کشتی یا جہاز، پانی میں اتارتے ہیں تو اس کا حجم زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اچھال کی قوت کی وجہ سے وہ تیرتا رہتا ہے۔

اب اگر اس کشتی میں تھوڑا سا وزن مزید بڑھا دیا جائے تو اس کے نیچے سے تھوڑا سا مزید پانی اطراف میں منتقل ہوجائے گا۔ اس کے رد عمل میں اچھال کی قوت مزید بڑھے گی اور کشتی تیرتی رہے گی۔ لیکن اگر کشتی میں وزن اس قدر

بڑھادیا جائے کہ اس کے نیچے سے اطراف میں منتقل ہونے والے پانی کا حجم اس سے کم ہوجائے تو اچھال کی قوت بھی وزن سے کم بنے گی اور نتیجتاً کشتی ڈوب جائے گی۔

وزن اور حجم کے ساتھ ساتھ کشتی کے ڈھانچے کے مضبوطی بھی اہمیت رکھتی ہے۔ متلاطم سمندروں میں کمزور کشتیاں اور جہاز لمحوں میں موجوں کا نوالہ بن سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کشتی کے ہر حصے پر عمل کرنے والی اچھال کی قوت کا انحصار اس نقطے پر لہروں کی اونچائی پر ہوتا ہے۔ لہروں کی چوٹی پر جہاز کا وزن زیادہ دباؤ ڈالتا ہے۔ لہٰذا اچھال بھی زیادہ پیدا ہوتا ہے لیکن لہروں کے دامن میں دباؤ کم ہوتا ہے لہٰذا اچھال بھی کم ہوتا ہے۔ متلاطم سمندر میں اچھال کی قوت جہاز کی سطح کے مختلف حصوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور یہ صورت حال برابر تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہازوں کے ڈھانچے اس طرح ڈیزائن کئے جاتے ہیں کہ وہ اس قسم کے دباؤ کے خلاف زیادہ سے زیادہ قوتِ برداشت رکھتے ہیں۔

سب سے خراب صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب متلاطم لہروں کی لمبائی جہاز کی لمبائی کے برابر ہو۔ ایسی صورت میں جہاز لہروں کی چوٹیوں پر ہوتا ہے۔ اس وقت اچھال کی قوت جہاز کے کناروں پر عمل کررہی ہوتی ہے اور جہاز کا وزن درمیانی حصے پر۔ اگر ڈھانچہ ذرا بھی کمزور ہو تو درمیان میں سے خم کھا سکتا ہے۔ دوسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ لہر کی چوٹی جہاز کے درمیانی حصے میں ہو۔ اس طرح اچھال کی قوت درمیان میں عمل کرتی ہے اور جہاز کا وزن کناروں پر۔ ایسی صورت میں بھی جہاز درمیان سے ٹوٹ کر دو حصے ہو سکتا ہے۔ چھوٹی کشتیوں کی نسبت یہ خطرات بہت بڑے جہازوں کے لئے زیادہ ہوتے ہیں۔ مثلاً مال بردار جہاز یا تیل لے جانے والے جہاز۔ اسی لئے ان جہازوں کی چوڑائی بھی خاصی زیادہ رکھی جاتی ہے تاکہ لمبائی قابل لحاظ حدود میں رکھی جاسکے۔

خمیدہ کردینے والی ان قوتوں کے علاوہ جہاز کو پانی کے اندرونی دباؤ کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ دباؤ سمندر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہتا ہے۔ خاص طور پر ایسے جہاز جو گہری تہہ والے ہوں، اس دباؤ کی زد میں ہوتے ہیں اِسی لئے انہیں غیر معمولی طور پر مضبوط بنایا جاتا ہے۔

جہاز کے توازن اور استحکام کا انحصار تین فرضی نکات (سینٹر آف گریوٹی، سینٹر آف باؤنسی اور میٹا سینٹر) کے باہمی رشتے پر ہوتا ہے۔ جہاز کے وزن کو واحد قوت فرض کیا جاتا ہے جو نیچے کی طرف عمل کرتی ہے۔ اسے سینٹر آف گریوٹی (G) کا نام دیا گیا ہے۔ اچھال وہ واحد قوت ہے جو اوپر کی طرف عمل کرتی ہے۔ اسے سینٹر آف باؤنسی (B)

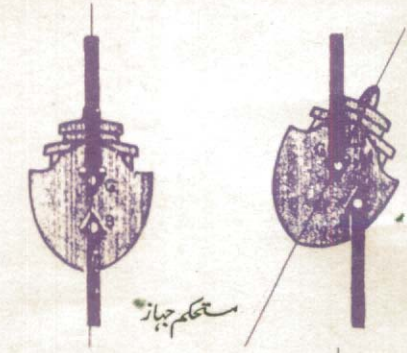

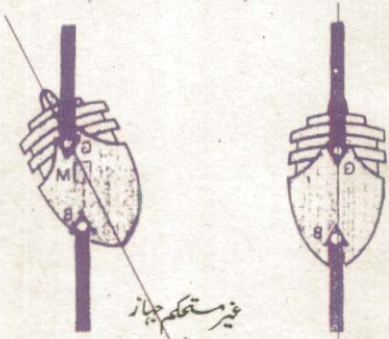

کہا گیا ہے۔ جب ایک جہاز متوازن اور سیدھی حالت میں ہوتا ہے تو مندرجہ بالا دونوں قوتیں ایک ہی لائن میں، برابر طاقت سے متضاد سمتوں میں عمل کر رہی ہوتی ہیں۔ یہ لائن جہاز کے بالکل وسط سے کھینچی جاتی ہے۔ اب اگر جہاز ہوا، یا لہروں کی وجہ سے ایک طرف کو جھک جاتا ہے تو سینٹر آف گریوٹی تو تبدیل نہیں ہوتا البتہ سینٹر آف باؤنسی سینٹر لائن سے تبدیل ہو کر جہاز کے نچلے حصے میں آجاتا ہے۔ جہاز کا نیچے کی طرف پڑتا ہوا وزن اور باؤنسی کی اوپر کی جانب لگتی ہوئی قوت جہاز کو دوبارہ سیدھی حالت میں لے آتی ہے۔ جب جہاز ایک جانب جھکتا ہے تو عمودی لائن، جس پر کہ باؤنسی کی قوت عمل کرتی ہے۔ اصل سینٹر لائن سے جس پوائنٹ پر ملتی ہے، اسے میٹا سینٹر (M) کہتے ہیں۔ جب تک میٹا سینٹر، سینٹر آف گریوٹی سے اوپر ہوگا، جہاز متوازن اور مستحکم ہوگا اگر یہ سینٹر آف گریوٹی سے نیچے ہوگا تو جہاز مستحکم نہیں ہوگا۔ اور جب ایسا جہاز ایک جانب کو جھکے گا تو وزن اور باؤنسی کی قوت کی وجہ سے مزید اسی طرف جھکتا چلا جائے گا اور بالآخر الٹ جائے گا۔ عام طور پر متوازن اور مستحکم جہاز ڈیزائن کئے جاتے ہیں۔ البتہ ایسے جہازوں کے الٹ جانے کی وجہ سے اکثر ان پر گنجائش سے زیادہ وزن لادنا ہوتا ہے۔

پہلے وقتوں میں موسم کی خرابی کے باعث جہازوں کو اکثر بندرگاہوں پر کھڑے کھڑے کئی کئی روز تک انتظار کرنا پڑتا تھا۔ لیکن لائف بوٹ کی ایجاد نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ یہ کشتیاں اس طرح بنائی جاتی ہیں کہ ہر قسم کے موسم میں استعمال ہو سکیں۔ ایسی کشتیاں اگر کبھی سمندر میں لہروں کے زور کی وجہ سے الٹ بھی جائیں تو فوراً خود بخود سیدھی ہو جاتی ہیں۔

یوں انسان نے اپنی ذہانت سے منہ زور لہروں کو قابو میں کر کے بے بیکراں سمندر پر بھی اپنی حکمرانی قائم کر لی ہے۔

پہیلی

تنویر پھول

بتاؤ تم، بھلا کیا چیز ہے جو چلتی رہتی ہے؟
ہیں بارہ منزلیں اس کی انہیں طے کرتی رہتی ہے
اگر دُم کاٹ کر اس چیز کی تن سے جدا کر دو
وہیں پہ حرفِ اوّل کو جو تم جا کر کھڑا کر دو
بنے گی چیز ایسی جس کو بے شک جانتے ہو تم
گھروں میں رکھتے ہو جس کو، جسے پہچانتے ہو تم
جسے تم دو اگر پانی، وہ دے گا پھر تمہیں پانی
صراحی ہے بہن جس کی، گھڑونچی جس کی ہے نانی
جو اکثر گود میں نانی کی اپنی بیٹھا رہتا ہے!
"میں نانی کا چہیتا ہوں" گھمنڈ سے جو یہ کہتا ہے
بتا دی ہیں بہت باتیں، دماغ اپنا لڑاؤ تم
نرے بدّھو ہو گر اب بھی نہ نام اس کا بتاؤ تم
ہمیشہ ہر گھڑی چلتے ہی رہنا کام ہے اس کا
یہ مصرع خود بتا دے گا تمہیں کیا نام ہے اس کا
اسی سے وقت کے پابند سارے لوگ رہتے ہیں
بتایا پھولؔ نے انگلش میں اس کو "واچ" کہتے ہیں

انعامی لطیفہ

اسکاٹ لینڈ کے باشندے بڑے کنجوس مشہور ہیں۔ ایک اسکاچ نے اپنے پسندیدہ رسالے کے ایڈیٹر کو خط لکھا "اگر آپ نے اپنے رسالے میں اسکاٹ لینڈ کے باشندوں کی کنجوسی کے متعلق لطیفے دینا بند نہ کئے تو میں اپنے ہمسائے سے آپ کا رسالہ مانگ کر پڑھنا چھوڑ دوں گا۔"

مرسلہ : طارق رفیق بھٹی، اوکاڑہ۔

سائنس کے استاد نے طلبہ کو دودھ کے عنوان پر مضمون لکھنے کو کہا۔ مضمون کے بارے میں استاد نے ہدایت دی کہ اسے کم از کم چار صفحات پر مشتمل ہونا چاہئے۔ ایک شاگرد نے تھوڑی دیر بعد ہی ایک صفحہ لکھ کر استاد کو دکھایا تو استاد نے ناراضگی سے کہا۔

"نالائق! میں نے چار صفحے لکھنے کو کہا تھا۔"

"سر میرا مضمون خشک دودھ پر ہے۔" بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔

مرسلہ : شگفتہ نسیم، کراچی

☆ ..... ☆

ایک دن رضوان اسکول دیر سے پہنچا تو ماسٹر صاحب نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی، رضوان نے کہا۔ "جناب مجھے دیر اس لئے ہوگئی کہ

روزانہ جس راستے سے آتا تھا۔ وہ خراب تھا۔ میں دوسری سڑک سے آرہا تھا کہ راستے میں ایک بورڈ نظر آیا۔"

ماسٹر صاحب نے رضوان کو گھورتے ہوئے کہا۔

"بورڈ سے تمہارے دیر سے آنے کا کیا تعلق ہے؟"

"وہی بتانے والا ہوں سر۔" رضوان نے کہا۔

"دراصل اس بورڈ پر لکھا تھا.... آگے اسکول ہے آہستہ چلیں۔"

مرسلہ : عندلیب خان، پشاور

☆ ..... ☆

ایک مقامی بلیڈ کمپنی نے اپنے تیار کردہ بلیڈوں کی تشہیر کے لئے اخبارات میں کچھ یوں اشتہار دیا۔

"اس ماہ شہر میں جتنے بھی جیب کترے پکڑے گئے ہیں۔ ان سب کے پاس سے ہماری ہی کمپنی کے تیار کردہ بلیڈ برآمد ہوئے ہیں۔ اس سے آپ ہمارے تیار کردہ بلیڈوں کی اہمیت و مقبولیت اور کارکردگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔"

مرسلہ : عادل امین، کراچی۔

☆ ..... ☆

ایک شخص (دوسرے سے) "اگر میں دیکھوں کہ ایک آدمی اپنے گدھے کو بے دردی سے مار رہا ہے اور اگر میں اسے ایسا کرنے سے روکوں تو اس جذبے کو کیا کہیں گے؟"

"برادرانہ محبت۔" دوسرے شخص نے جواب دیا۔

مرسلہ : فرخ احمد، کراچی۔

☆ ..... ☆

ایک تھکا ہوا بس ڈرائیور خالی بس میں ڈرائیونگ سیٹ پر ہی سوگیا۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے بس کا شیشہ کھٹکھٹایا اور وقت پوچھا۔ بس ڈرائیور نے آنکھ کھولی اور گھڑی میں وقت دیکھ کر اس کو بتادیا۔ تھوڑی دیر بعد شیشے پر پھر کھٹ کھٹ ہوئی۔ بس ڈرائیور غصے میں اٹھا اور بولا۔

"کیا ہے؟"

اس شخص نے ٹائم پوچھا۔ بس ڈرائیور نے اسے بھی ٹائم بتادیا اور پھر سوگیا اسی طرح وہاں سے گزرنے والے ٹائم پوچھ کر اس کی نیند خراب کرتے رہے۔ آخر ڈرائیور کی سمجھ میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے ایک بڑے کاغذ پر موٹا موٹا لکھ دیا۔

"میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔ اس لئے مجھے ٹائم معلوم نہیں ہے۔"

یہ کاغذ اس نے شیشے پر چپکا دیا اور سوگیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ شیشے پر پھر کھٹ کھٹ ہوئی۔ ڈرائیور بھڑک کر اٹھا اور چیخ کر بولا "کیا مصیبت ہے؟"

وہ شخص بولا۔ "آپ چیخ کیوں رہے ہیں۔

میں نے آپ کا لکھا ہوا کاغذ پڑھا کہ آپ کو گھڑی نہ ہونے کے باعث وقت معلوم نہیں ہے۔ تو میں آپ کو وقت بتانے آیا ہوں۔ اس وقت صبح کے ساڑھے دس بج رہے ہیں۔"

مرسلہ : زین اختر، بھلوال

☆ ..... ☆

ایک شخص کو ہر بات پر اعتراض کرنے کی عادت تھی۔ ایک دن گھر آئے تو انہیں کوئی قابل اعتراض بات نظر نہ آئی۔ بہت جھنجھلائے۔ اچانک ان کی نظر بیوی پر پڑی، بولے۔

"بیگم بہت فضول خرچ ہوتی جارہی ہو۔"

بیگم نے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

وہ صاحب جھٹ سے بولے "بھئی جب ایک چٹیا سے کام چل سکتا ہے تو دو چٹیاں بنانے کی کیا ضرورت تھی۔"

مرسلہ : اویس قاسم، منڈی بہاؤالدین

☆ ..... ☆

استاد (شاگرد سے) "انگریزوں نے ہندوستان میں پہلا قدم رکھنے کے بعد کیا کیا؟"

شاگرد : "سر! انہوں نے دوسرا قدم رکھا۔"

مرسلہ : انعم نعیم، کراچی۔

☆ ..... ☆

ایک افسر اپنے ملازم کو ڈانٹ رہا تھا اور جواب میں ملازم مسکرا رہا تھا۔ جس پر افسر نے ملازم سے پوچھا۔

"تم ہنس کیوں رہے ہو؟"

ملازم نے انکساری سے جواب دیا

"میں مصیبت کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کررہا ہوں۔"

مرسلہ : عروبہ عاصم (؟)

☆ ..... ☆

گاڑی چلاتے ہوئے شوہر کا مارے گرمی سے بُرا حال ہوگیا تو وہ بیگم سے بولا، بیگم، ذرا شیشے تو نیچے کردو۔ مارے گرمی کے برا حال ہوا جارہا ہے۔

بیگم بولی، "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ پیچھے پڑوسیوں کی گاڑی آرہی ہے، اگر انہوں نے شیشے نیچے کئے ہوئے دیکھے تو سمجھیں گے ہماری گاڑی میں ایئر کنڈیشنر نہیں ہے۔"

مرسلہ : محمد عدنان شاہد، لاہور

☆ ..... ☆

بیوی (خاوند سے) "آج صبح جو آپ چھ انڈے لائے تھے، ان میں سے چار بطخ کے تھے۔"

خاوند : "تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ وہ بطخ کے انڈے ہیں؟"

بیوی : "اب میں اتنی کم عقل نہیں ہوں۔ پانی میں ڈالے تو بطخ کے انڈے تیرنے لگے اور مرغی کے ڈوب گئے۔"

مرسلہ : افتخار دانش، کراچی۔

☆ ..... ☆

ایک خاتون (دوسری خاتون سے) "بہن تم مٹھائی کا ڈبہ غسل خانے میں کیوں رکھ رہی ہو؟"

دوسری خاتون : "بہن! یہی تو وہ جگہ ہے جہاں ننھا کئی کئی ہفتے داخل نہیں ہوتا۔"

مرسلہ : فریال گوہر، کراچی۔

☆ ..... ☆

صاحب (اپنے مالی سے) پودوں کو پانی کیوں نہیں دیا؟

مالی، حضور! آج تو بارش ہو رہی ہے!

صاحب (غصے سے) بارش کے بچے! کیا چھتری لے کر پودوں کو پانی نہیں دے سکتا؟

مرسلہ : نعیم اختر چغتائی۔ (؟)

☆ ..... ☆

ڈاکٹر نے مریض سے پوچھا "میں نے آپ کو ایک سال کے بچے کی ہلکی خوراک کھانے کو کہا تھا، کیا آپ نے کھائی؟" مریض نے کہا "جی ہاں کھائی تھی۔" ڈاکٹر نے پوچھا "کیا کھایا تھا؟" مریض نے جواب دیا۔

"نارنگی کے چھلکے، تھوڑی سی مٹی، ایک شیشے کی گولی، کچھ کاغذ کے ٹکڑے۔"

مرسلہ : عارفہ بنت شارق، کراچی

☆ ..... ☆

ایک دس سالہ بچے نے ایک امیر بوڑھے سے کہا۔ "اگر آپ مجھے دس روپے دے دیں تو میں بچھڑے ہوئے والدین کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

امیر آدمی نے ترس کھا کر دس روپے اس کے حوالے کر دیئے اور پوچھا "تمہارے والدین کہاں ہیں؟"

بچے نے جواب دیا "وہ سامنے والے سینما میں فلم دیکھ رہے ہیں۔"

☆ ..... ☆

مسافر : یہ کیسا ہوٹل ہے؟ ساری چھت ٹپک رہی ہے میرا کمرہ تو تالاب بنتا جا رہا ہے

بیرہ : جناب ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہر کمرے میں پانی بھی ہوگا۔

مرسلہ : قدسیہ احمد، کوٹ ادو

لطائف کے اس سلسلے میں آئندہ سب سے اچھے لطیفے پر انعام بھی دیا جائے گا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ انعام آپ کو ملے تو گھسے پٹے اور شائع شدہ لطائف نہ بھیجیں بلکہ اچھی اچھی کتابوں سے نئے اور دلچسپ لطائف اور مزاحیہ واقعات ارسال کریں۔ سب سے اچھا لطیفہ بھیجنے والے ساتھی کو بطورِ انعام تین ماہ کے لئے آنکھ مچولی جاری کیا جائے گا۔

اب میں کیا کروں؟

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں..... اسکول پتوکی کا طالب علم ہوں۔ اس اسکول کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے میں لڑکیاں پڑھتی ہیں جبکہ دوسرے حصے میں لڑکے پڑھتے ہیں۔ اسکول کے دو مختلف حصے ہونے کی وجہ سے مقابلے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ میڈموں کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ کسی بھی امتحان میں لڑکے فرسٹ نہ آسکیں جبکہ استادوں کی کوشش ہوتی ہے کہ لڑکیاں کسی طرح اوّل پوزیشن حاصل نہ کر سکیں۔ اس وجہ سے اکثر میڈیم لڑکوں کو کم نمبر دے کر پیچھے چھوڑنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جس کی وجہ سے لڑکوں کا بلاوجہ نقصان ہوتا ہے۔ آخر ہمارا قصور کیا ہے؟ میڈموں کی اس غلط حرکت کی وجہ سے ہر سال بعض لڑکے کم نمبروں کی وجہ سے اسکول اور تعلیم چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ان کا جائز حق مارا جاتا ہے۔ ہم نے پرنسپل صاحب سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ بتایئے اب میں کیا کروں؟ (ش۔ع۔ع۔ پتوکی)

اگست کے شمارے میں لیاقت آباد کراچی کے نوید کامران کا مسئلہ شائع ہوا تھا ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کراچی شہر اور خاص طور پر اپنے علاقے میں دہشت گردی کے واقعات سے سخت پریشان ہیں۔ ان کے بقول اٹھارہ انیس سال کے لڑکوں نے اسلحہ اٹھا رکھا ہے اور جب انہیں ایسا کرنے سے منع کیا جاتا ہے تو وہ اس کو بزدلی قرار دیتے ہیں۔ نوید کامران نے لکھا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات میں کیا کیا جائے۔ کبھی تو ہتھیار اٹھا لینے کو جی چاہتا ہے لیکن پھر خیال آتا ہے کہ یہ سب مسئلے پیار و محبت سے حل ہوں گے۔ اس مسئلے کے جواب میں ملک بھر سے ہمیں مسلسل خطوط موصول ہو رہے ہیں جن میں نوید کامران سے ہمدردی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ان خطوں سے محسوس ہوتا ہے کہ کراچی کے حالات پر ملک کے تمام ساتھیوں کو بڑی تشویش ہے اور وہ سب دل سے چاہتے ہیں کہ اس شہر کے حالات بہتر ہو جائیں اور اللہ سب کو سکون سے زندگی گزارنا نصیب کرے۔ (آمین) ان خطوں سے منتخب خطوط کے اقتباسات یہ ہیں۔

سیدہ رباب طاہرہ، گجرات : آپ اپنے محلے کے تمام بزرگوں اور ان لڑکوں کے والدین

سے رابطہ کریں اور انہیں اکٹھا کر کے اس مسئلے کو حل کرنے کی ترکیب سوچیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ لوگ آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔ پھر آپ لوگ ان لڑکوں کے پاس جائیں جنہوں نے اسلحہ اٹھا رکھا ہے اور انہیں دہشت گردی کے نقصانات سے آگاہ کریں اور اگر وہ پھر بھی باز نہ آئیں تو قانون کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اللہ آپ کو آپ کے مقصد میں کامیاب کرے۔ (آمین)

جبران حبیب، ناظم آباد، کراچی : یہ مسئلہ صرف نوید کامران صاحب کا نہیں، ہم سب کا ہے۔ اگر نوید صاحب ہار مان لیں گے تو گویا وہ دشمن کی خواہش پوری کریں گے۔ اگر ہم اپنے دلوں سے نفرتوں کو دور بھگا دیں تو سب مسئلے حل ہو جائیں گے اور ہمارے بچوں کے ہاتھوں میں ہتھیار کے بجائے علم کی شمع ہوگی۔

طارق رفیق بھٹی، اوکاڑہ : آپ ناامید نہ ہوں۔ کیونکہ ہر تاریک رات کے بعد ایک روشن صبح ضرور طلوع ہوتی ہے۔ ظلم کے خلاف ڈٹ جانا جہاد ہے۔ آپ صبر کریں کیونکہ اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

افشاں غفار، گلبرگ کراچی : کراچی کے عوام دہشت گردوں سے تنگ آچکے ہیں اور ان کا سکون برباد ہو چکا ہے۔ یہ سب خراب حالات مذہب سے دوری کا نتیجہ ہے۔ ہم سب کو آپس میں متحد ہو جانا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے۔ حکومت بھی نیک نیتی سے کراچی کے حالات درست کرنے کی کوشش کرے۔ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کے اسکول جلد کھل جائیں گے۔ کیونکہ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

محمد عدیل دانش، لانڈھی کراچی : نوید صاحب! میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنے کام سے کام رکھیں اور ان مسئلوں میں نہ پڑیں۔ اگر دہشت گرد لڑکوں کو آپ سیدھے راستے پر لانا چاہیں گے تو وہ آپ کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔

شگفتہ صدیقی، گلبرگ کراچی : نوید کامران صاحب! حکومت کی بے حسی دیکھ کر ہمارے احساسات وہی ہیں جو آپ کے ہیں۔ آپ تو لڑکے ہو نا۔ ہم تو لڑکی ہو کر یہ سوچتے ہیں کہ کیا ہم چوڑیاں توڑ کر کلاشنکوف ہاتھوں میں اٹھالیں۔ لیکن پیارے بھائی! آپ مایوس نہ ہوں۔ کیونکہ آپ نے وائٹل سائنز کا وہ گانا نہیں سنا۔ "ظلم کا سورج ڈھل جائے گا، وہ دن بھی ہم دیکھیں گے۔"..... یقیناً ظلم کا سورج ایک دن ضرور ڈھلے گا۔۔۔۔

نوید الحسن تابش، سانگلہ ہل : نوید کامران نے جو تشویش ناک مسئلہ چھیڑا ہے، اس کے دو ہی حل ہیں۔ ایک تو ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے

انعام یافتہ حل

آج کل ملک کے بالعموم اور کراچی کے بالخصوص جو حالات ہیں اس پر ہر محب وطن' صاحب دل' پرامن شہری سخت مضطرب اور پریشان ہے کہ میری پھولوں اور خوشبوؤں کی دھرتی میں یہ آگ و خون اور بارود کی بُو کس نے بھر دی ہے۔ یہ مسئلہ صرف نوید صاحب کا نہیں پوری پاکستانی قوم کا ہے۔ ہر ایک کو سوچنا ہے ہر ایک کو اپنے حصے کا فرض ادا کرنا ہے۔ ان حالات میں مصلحت کا لبادہ اوڑھنا' بزدلی کی چادر تاننا' شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دینے سے کام نہیں چلے گا۔ ہمارے مذہب نے برائی کو ہاتھ سے روکنے کا حکم دیا ہے اور جو پوری جرأت سے برائی کو نہیں روکتا' صرف دل اور زبان سے مذمت کرتا ہے وہ کمزور ایمان کا حامل ہے۔ کمزور ایمان والے اس آتش نمرود میں نہیں کود سکتے۔ ظلم سہنا بھی جرم ہے۔ جو لوگ ظلم و تشدد کے ہاتھوں کو نہیں روکتے۔ وہ ظالم کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں۔

جب انسان کی عزت خطرے میں ہو' گھر اور چار دیواری کا تقدس پامال ہو رہا ہو تو اس وقت بزدلی اور شرافت کی چادر اوڑھنا سب سے بڑی بزدلی بلکہ بے غیرتی ہے۔

ہمیں ان دہشت گردوں کا مقابلہ کرنا ہے جو مٹھی بھر ہو کر پورے شہر کو یرغمال بنائے ہوئے ہیں۔ دہشت گرد کا کوئی مذہب' کوئی نظریہ اور کوئی اصول نہیں ہوتا۔ وہ صرف طاقت کی زبان سمجھتا ہے۔ اگر ہم نے مل کر ان دہشت گردوں کا مقابلہ نہ کیا تو پھر ہماری داستان تک نہ ہوگی داستانوں میں۔۔۔۔۔۔

(محمد حیات خان نیازی' مری روڈ راولپنڈی)

گناہوں کی معافی مانگیں اور اسی سے مدد طلب کریں' دوسرے اپنی حفاظت آپ کرنے کا انتظام کرنا چاہئے۔ ہمیں دہشت گردوں کے مقابلے میں خود کو منظم کرنا چاہیے' اسی طرح ہم اس مسئلے سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔

شبانہ حنیف' ٹنڈو آدم : دعا ہی اب تو ایک ایسا ہتھیار ہے جسے جب چاہیں آپ استعمال کر سکتے ہیں .... کیونکہ سننے والا آپ کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

نائلہ بختیار' کوہاٹ : بھئی نوید کامران صاحب! آپ کو ہمت و حوصلہ سے کام لینا ہوگا۔ ہمت نہ ہاریں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بے ہمتی قابل ملامت ہے۔

سوال آدھا جواب آدھا

مرتب: محمد بن مالک

مقابلہ نمبر ۳ کے درست جوابات

(۱) حضرت یونس علیہ السلام (یونس ابن متی) (۲) حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ

(۳) علامہ شبلی نعمانی (۴) عابد علی عابد

(۵) دونوں نے ۱۷۸۳ء میں گیس کے غبارے کے ذریعے پہلی کامیاب پرواز کی

(۶) تین۔ (۷) چندر گپت بکرماجیت

(۸) روانڈا (۹) ایک کیڑے (Insect) کا

(۱۰) اسمتھ، سلوان اور سوبرز

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والے ساتھی

(۱) انعام اللہ خان، پشاور (۲) رحمت علی، سکرنڈ (۳) مجاہد نور، لالہ موسیٰ

بالکل درست جوابات دینے والے ساتھی

محمد انور، کراچی۔ نور اللہ چغتائی، کوئٹہ۔ محمد اسلم، محمد اکرم، دریا خان۔ شوکت علی بلوچ، کراچی۔ ابراہیم آرائیں، ساہیوال۔ عبدالحق راشد، منڈی بہاؤالدین۔ سراج الحق، رقیہ جمال، سعدیہ جمال، آمنہ جمال، کراچی۔ محمد عمر، محمد صدیق، بہاول پور۔ ظفر اقبال انصاری، مظہر اقبال انصاری، کوٹ ادو۔ خرم شیرازی، فرخ شیرازی، کوٹ مٹھن۔ نور محمد چانڈیو، خیرپور میرس۔ اسد عمران، فیصل اقبال، سرگودھا۔ فارینہ اسلم، محمد علی اعجاز، سید افتخار احمد، خانیوال۔ سلمٰی شاہ عمر، رعنا فرحت، کراچی۔ مبشیر طیب علی، مبشر محمود، لاہور۔ مصطفےٰ شہزاد، شاکرہ نسیم، عبدالحمید، راولپنڈی۔ جاوید اقبال، اسلام آباد۔ سجاد احمد فرحانہ ثمرین، کراچی۔ ساجد جمیل، کراچی۔ ہالہ تصدق، کراچی۔ اسما اعظمی حیدر آباد۔ مدثر علی خان، عنبر خان۔ بہاول نگر۔ ماروی محمود، رفعت سبحان، کراچی۔ راؤ یاور حیات خان، ملتان۔ معراج سعادت، کراچی۔ راشد عبدالغفار، کراچی۔ رعنا سید، کراچی۔ رشید اشرف، شبانہ یوسف، حیدر آباد۔ محمد عدنان اسلم، سرگودھا۔ ندرت ثمین، شاہد رسول، شیخوپورہ۔ رقیہ قدیر، مرتضیٰ علی، پشاور۔ ریحان اختر، ملتان۔ محمد عمران، نارتھ کراچی۔ محمد بلال، کراچی۔ عائشہ سمیہ، اسماء بتول، کراچی۔

آنکھ مچولی کے پرانے شمارے کیسے منگوائیں؟

ہمیں قارئین کے ایسے بہت سے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں جن میں وہ آنکھ مچولی کے پرانے شمارے منگوانے کا طریقہ کار دریافت کرتے ہیں۔ اگر آپ آنکھ مچولی کے پرانے شمارے منگوانا چاہتے ہیں تو ان شماروں کی تفصیل، نصف قیمت کا منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتا ہمیں روانہ کر دیجیے۔ ہم پرچے آپ کو بھجوا دیں گے۔

خط و کتابت کے لئے پتا:

منیجر سرکولیشن، ماہنامہ آنکھ مچولی I۔ پی آئی بی کالونی کراچی ۷۵ فون: ۴۹۴۲۸۵۷ ۴۹۴۸۲۱۰

نام آنکھ مچولی

قارئین کے منتخب خطوط

پرنس افضل شاہین، بہاولنگر۔ اگست کا شمارہ خوبصورت سرورق کے ساتھ موصول ہوا "جوالا مکھی پہاڑ" "ریس" "سانپ" اور "اولے کا بدلہ" جیسی تحریریں پسند آئیں۔ نظموں میں "حمد باری تعالیٰ" "ایٹم" "پیارکروں" اور "جنگل کی سیر" اچھی لگیں۔ **عبدالقدیر انڈہڑ، پنوں عاقل** شمارہ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ ملا۔ کہانیاں سب لاجواب تھیں۔ خاص کر "ایک دفعہ کا ذکر ہے۔" "پاگل کون" اور "سانپ" بہت پسند آئیں۔ **فہد ایوب، صادق آباد** اس دفعہ آنکھ مچولی کچھ پہلے ہی مل گیا۔ شکریہ! ٹائٹل بھی خوبصورت تھا۔ کہانیوں میں "اولے کا بدلہ" اور پہلی مہم پسند آئیں۔ قلم دوست میں "موت کی آواز" اچھی لگی۔ "بوریوالہ ایکسپریس" کا انٹرویو پسند آیا۔ **نصرت شمشاد (؟)** آنکھ مچولی کا سب سے شاندار سلسلہ "قلم دوست ہے بلکہ ہمارا خیال ہے یہ سلسلہ آنکھ مچولی کی جان ہے۔ **رحمت اللہ بشیر، گجرات** ایڈیٹر بھیا! اگست کا شمارہ جلد ہی مل گیا ہے۔ اداریہ پڑھ کر اتنی خوشی ہوئی کیا بتائیں یقین نہیں آتا کہ آپ بھی اتنا اچھا لکھ سکتے ہیں!! **ناصر بیگ میرپور خاص۔** "سانپ" "پاگل کون" پسند آئیں۔ نظم "پیارکروں" اچھی لگی۔ **محمد ندیم اقبال، ملکوال** آنکھ مچولی کا سرورق پسند آیا۔ نظمیں اس بار بہت اچھی تھیں۔ کہانیوں میں "شادی یا بربادی" بہت پسند آئی۔ **محمد عظیم قریشی، اسلام آباد** جنوری ۹۵ء میں میری ایک

نظم "مچھر" قلم دوست میں شائع ہوئی تھی لیکن مجھے قلم کا تحفہ نہیں ملا--- ○ --- بھائی عظیم! قلم کا تحفہ تو قارئین کے لئے تھا۔ آپ کو تو شمارہ اعزازی بھیجا گیا تھا۔ **شگفتہ صدیقی، کراچی** اگست کے آنکھ مچولی کا سرورق اتنا خوبصورت تھا کہ دل مسرت سے جھوم اٹھا ہر تحریر اپنی جگہ لاجواب تھی۔ **سید نذیر ملکوال** قلم دوست میں عقیل مختار کا انٹرویو پڑھ کر اس بات کا یقین ہو گیا کہ ابھی پاکستان کا مستقبل محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ سارے نوجوانوں کو عقیل مختار جیسا بنائے۔ آمین! **تنویر حسین، کراچی** آنکھ مچولی پڑھنے کے بعد احساس ہوا کہ ابھی پاکستان میں بچوں کے چند ایسے رسالے موجود ہیں جو بچوں کے لئے صاف ستھرا اور معیاری ادب مہیا کر رہے ہیں۔ **محمد عاصم شہزاد خان، لاہور** غالباً" آنکھ مچولی ہی پاکستان کا وہ واحد جریدہ ہے جس میں بچوں کی صحیح ذہنی اور اخلاقی نشوونما کی جاتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ اب آنکھ مچولی "اسلامی نمبر" نکالے۔ **محمد سلیم بخش، کراچی۔** اگست کا شمارہ خوبصورت سرورق کے ساتھ ملا سب کچھ ٹھیک تھا۔ **عدیل ستار، کراچی۔** "سنہرے حروف" شاندار تھا۔ کہانیوں میں "سانپ" "شادی یا بربادی" اور "ادلے کا بدلہ" بے حد پسند آئیں۔ **فوزیہ علوی، پٹارو۔** "ماہ رواں کی پہلی بات" بہت اچھی لگی۔ ڈرامہ "پاگل کون" اچھا تھا کہانیوں میں محمد بن مالک کی تحریر بہت بہترین تھی۔ **سیف اللہ شاہین، حافظ آباد** "توہین رسالت پر سزائے موت کیوں؟" اور "نظیر اکبر آبادی پر مضامین پسند آئے۔ کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ ہنستے ہنستے میں لطائف البتہ گھسے پٹے تھے۔

بابر زمان، کراچی۔ اگست کا شمارہ حسب معمول پہلی تاریخ کو ہی مل گیا۔ سرورق بہترین تھا۔ کہانیوں میں "سانپ" "شادی بربادی" اور "پہلی مہم" بہت پسند آئیں۔ **عرفان، فرمان، انجم، منصور(؟)۔** اگست کا شمارہ پڑھا تمام کہانیاں اچھی تھیں بے حد پسند آئیں۔ **محمد حسین عارف، کراچی۔** اس مرتبہ شمارے میں "ریس" "سانپ" "شادی یا بربادی" اور "ایک دفعہ کا ذکر ہے" بے حد پسند آئیں۔ **میمونہ عارف، کراچی** تازہ شمارے میں خوبصورت اور اچھی کہانیوں کا انتخاب لاجواب تھا۔ **فاطمہ عارف، کراچی۔** تازہ شمارے میں "سانپ" "شادی یا بربادی" "ادلے کا بدلہ" جیسی کہانیاں پسند آئیں۔ سلسلے وار ناول کا دوسرا حصہ پڑھ کر ہم تجسس میں پڑ گئے۔ **علی عمران قمر، پتوکی۔** حسب روایت تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ آپ نے انعامی مقابلوں میں شرکت کی تاریخ بڑھا کر قارئین کو ان مقابلوں میں زیادہ سے زیادہ شرکت کا موقع دیا ہے۔ **محمد فاروق منیر، لاہور، کاشف جمیل، تربت۔** جولائی کے شمارے میں فہرست میں صفحہ نمبر ۹۷ پر عبدالستار خان طاہر کی تحریر "کولمبس..... کہاں دفن ہے" لکھا تھا جبکہ عبدالستار خان طاہر کا مضمون پورے شمارے میں کہیں بھی نہ تھا ہاں اس صفحے پر بختیار احمد کی کہانی "عوام کی خدمت" موجود تھی۔ ○ --- عبدالستار کا مضمون اگست میں شائع ہونا تھا غلطی سے جولائی کی فہرست میں ان کا نام چھپ گیا۔ اس غلطی پر معذرت خواہ ہیں۔ **سمیرا اقبال، کراچی۔** جولائی کے شمارے میں "ایک تھیں اماں" "پڑیئے گر بیمار" "فاتح" "مستقبل کا خوف" "عوام کی خدمت" اسی طرح قلم دوست میں "دعا" "مستقبل کا آئینہ" نظم "میرا شہر مر رہا ہے" بہت پسند آئی۔ ریحانہ منیر کا ترجمہ "ٹھنڈی

موت" میں پہلے بھی کہیں پڑھ چکی ہوں یاد نہیں آرہا مگر کسی رسالے میں پڑھا تھا۔ **نورالسحر، کراچی۔** آنکھ مچولی ہر لحاظ سے ایک منفرد رسالہ ہے۔ سالانہ خریدار بننے کے لئے مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ○ --- آنکھ مچولی کے نام ۲۲۵ روپے کا ڈرافٹ یا منی آرڈر بھیج دیجئے۔ ایک سال تک رسالہ گھر بیٹھے آپ کو ملتا رہے گا۔ **منصور احمد مگسی، کندھ کوٹ۔** تیں کہانیاں لکھ چکا ہوں مگر آپ نے کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ○ --- بھائی منصور آپ کی تحریر میں دلچسپی اور روانی نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آپ مطالعہ نہیں کرتے۔ ایک اچھی تحریر لکھنے کے لئے ایک ہزار تحریروں کو پڑھنا پڑھتا ہے۔ **مسعود احمد سومرو، گڈو بیراج۔** آپ نے انعامی مقابلوں کی تاریخ ۳۰ تک بڑھا کر ہماری شکایات دور کردیں۔ بہت شکریہ! **فیصل احمد خان، کراچی** جولائی کا شمارہ کافی دیر سے ملا اور یہ پھر آپ نے رسالے کی قیمت بڑھادی!! **سیما مستنصر باللہ (؟)** اس ماہ کا آنکھ مچولی بہت اچھا لگا سرورق دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کہانیوں نظموں کے عمدہ انتخاب کے ساتھ ساتھ اس رسالے کو اچھوتے، دلکش اور منفرد سرورق بنانے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ **ریاض راہی برڑو، ٹنڈو محمد خان** جولائی کے پرچے میں "ڈاکو سے صحابی تک" "ایک تھی اماں" "دنیا تباہ ہورہی ہے" "میرے بچپن کے دن" "رفیع سودا" اور "وفادار دوست" پسند آئیں۔ قلم دوست میں "دعا" "بلی جو پلاسٹک کی تھیلی بن گئی" اچھی لگیں۔ **زبیر شاہد، بھکر** آنکھ مچولی بہت عرصے سے پڑھ رہا ہوں۔ یہ میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ اشتیاق احمد یا عمر احمد خان کا کوئی ناول چھاپیں۔ **ظہیر احمد، کراچی** "مستقبل کا آئینہ" "طوطا، شہزادہ اور لڑکی" اور سبق بہترین تحریریں تھیں۔ **سمن جبار، پشاور کینٹ۔** ہمارے گھر میں آنکھ مچولی بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے سب کہتے ہیں کہ بچوں اور بڑوں کے لئے یہ بہترین رسالہ ہے۔ **طارق گلاب، پشاور** میں آنکھ مچولی میں کہانی لکھنا چاہتا ہوں کہانی لکھنے کا طریقہ بتادیجئے۔ ○ --- چند کاغذ ایک قلم اور ایک محنت کرنے والا دماغ ..... یہ چیزیں دستیاب ہوں تو آپ ایک اچھی کہانی لکھ سکتے ہیں۔ **صائمہ محمد عثمان، کراچی** جولائی کا آنکھ مچولی لاجواب تھا۔ کہانیوں میں ایک تھی اماں اور "مستقبل کا خوف" بے حد پسند آئیں۔ **جویریہ تھانوی، کراچی۔** آپ نے رسالے کی قیمت کیوں بڑھادی۔ کسی زمانے میں تو خاص نمبر عام نمبروں کی قیمتوں میں آتے تھے۔ ○ --- کاش! وہ زمانہ دوبارہ آجائے۔ **منیرہ حبیب، کراچی** جولائی کا سرورق پسند نہیں آیا۔ کہانیوں میں "پڑیئے گر بیمار" "ڈاکو سے صحابی تک" اور "مستقبل کا خوف" اچھی کاوش تھیں۔ **سیدہ ارم زہرہ زیدی، پرانا سکھر** آپ رفتہ رفتہ آنکھ مچولی کی قیمت میں اضافہ کیوں کررہے ہیں اکٹھا ہی کیوں نہیں کردیتے بقول شاعر

یہ مانا کہ آپ کو مہنگائی کی زیادتی آزمانا ہے
ہماری جیبوں پہ ہوگا اس کا امتحاں کب تک

○... بھئی یہ شعر کس کا ہے۔ مہنگائی سے شعر کا توازن بھی بگڑ گیا ہے۔ **شہزاد محمود، کراچی** ابھی مہنگائی کا بوجھ کم بھی نہ ہوا تھا کہ نئے مالی سال کے بجٹ نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ آٹا، دال، چاول، چینی، گھی، تیل کی قیمتوں میں اضافہ پھر بجلی اور سوئی گیس کے بلوں میں اضافہ، حکومت اس طرح جلدی جلدی مہنگائی بڑھا رہی ہے۔ جیسے لائسنس کا دور واپس لانے کا ارادہ ہو۔

مُرغا چُوہا اور لال مُرغی

تحریر.... فیلیسائٹ لیفیور
ترجمہ.... نعیم مشتاق نومی

وہ پہاڑی بہت ہی خوبصورت، بہت ہی پیاری تھی۔ اس پہ ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ بہت ہی پیارا، بہت ہی خوبصورت۔ اس خوبصورت گھر کا ایک ہی دروازہ تھا۔ سبز رنگ کا۔ اور چار چھوٹی چھوٹی، پیاری پیاری کھڑکیاں تھیں، جن کے شٹر سبز رنگ کے تھے۔ اس چھوٹے سے خوبصورت گھر میں رہتے تھے۔ ایک مرغا، ایک چوہا، اور ایک مرغی (جس کا رنگ سرخ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مرغا اور چوہا اسے لالی کہتے تھے۔ جس کا مرغی نے کبھی بُرا نہیں منایا تھا)

اس پہاڑی کے قریب ہی ایک اور پہاڑی تھی۔ بہت بھدی اور بد صورت سی یہاں بھی ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ مگر بد صورت سا۔ اس گھر کا بھی دوسرے گھر کی طرح ایک ہی دروازہ تھا جو بند نہیں ہوتا تھا۔ اس کی دو کھڑکیاں تھیں۔ دونوں ٹوٹی ہوئی اور ان کے شٹر پر جو پینٹ تھا اس کا رنگ بھی اڑ چکا تھا اور کہیں کہیں سے وہ اکھڑ بھی چکا تھا۔

اس بد صورت گھر میں ایک بد صورت اور ڈھیٹ لومڑی رہتی تھی۔ اس کے ساتھ اس کے چار بچے بھی تھے۔ وہ بھی اپنی ماں کی طرح

بدصورت، ڈھیٹ اور بد تمیز تھے اور ہمیشہ گندے رہتے تھے۔ ان کے نام گندو، مندو، دندو اور چندو تھے۔

ایک دن، صبح سویرے بچے اپنی ماں، لومڑی کے پاس آئے۔

"اماں! ہمیں بہت بھوک لگی ہوئی ہے، کچھ کھانے کو دے۔" گندو نے اپنی بھدی آواز میں کہا۔

"کل بھی تم نے ہمیں کچھ نہیں دیا تھا۔" مندو پھٹی آواز میں بولا۔

"اور پرسوں بھی کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔" دندو نے تین ٹانگوں والی کرسی کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

"آج بھی اگر ہمیں کھانے کو کچھ نہ ملا، تو ہم چاروں مل کر کھانے کے تمام برتن توڑ ڈالیں گے۔" چندو گستاخانہ انداز میں بولا۔

ان کی باتیں سن کر لومڑی اپنے مخصوص چڑچڑے انداز میں بولی۔ "بکواس بند کرو..... اور مجھے کچھ سوچنے دو....."

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ یوں اچھل پڑی، جیسے اسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔

اس کے منہ سے بے اختیار بھدی آواز بر آمد ہوئی۔ "اخاہ! کیا ترکیب آئی ہے ذہن میں!"

"وہ کیا؟" چاروں نے بیک وقت پوچھا۔

"سامنے والی پہاڑی پر ایک مکان ہے۔" لومڑی بولی۔ "اور اس مکان میں ایک مرغا رہتا ہے۔" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"اور ایک چوہا بھی....." دندو نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔

"اور ایک لال مرغی بھی..... یعنی مزیدار لالی۔"

مندو بھی خوشی سے اچھلا۔

"وہ تینوں موٹے تازے اور کھانے والی شے ہیں....." چندو کے منہ میں پانی بھر آیا۔

"وہ تینوں اگر آج کسی طرح ہمارے پیٹ میں پہنچ جائیں تو مزہ آ جائے....." گندو خیال ہی خیال میں انہیں چبا رہا تھا۔

"آج ہی میں اس پہاڑی پر جاؤں گی، بلکہ ابھی" لومڑی بولی۔ "اور بوری لے کر جاؤں گی ..... اس میں ڈالوں گی..... مرغے کو..... چوہے کو ..... اور لال مرغی کو..... تینوں کو بوری میں ڈال کر گھر لاؤں گی..... اور پھر انہیں بھون کر کھائیں گے ..... مزے سے۔"

"میں تو مرغے کی دونوں ٹانگیں کھاؤں گا..... موٹی موٹی، پلی ہوئی ..... مزیدار۔" گندو ناچتے ہوئے بولا۔

"میں ان تینوں کی کلیجی اور دل نکال کر کھاؤں گا۔" مندو بھی ناچنے لگا۔ "وہ بہت مزیدار ہوتے ہیں۔"

"میں تو پورے کا پورا چوہا تل کر کھاؤں گا۔" دندو بھی ناچ میں شریک ہو گیا۔ "مجھے تو چوہے

پسند ہیں..... کالے کالے اور مزیدار۔"

وہ چاروں خوشی سے ناچنے لگے، اور مختلف چیزیں، جو پہلے ٹوٹی پھوٹی تھیں مزید ٹوٹنے لگیں۔

لومڑی نے بوری پکڑی اور انہیں ناچتا چھوڑ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔

دوسری طرف کی سنئے..... مرغا صبح سویرے بستر سے نکلتے ہی بولا۔ "آج تو بہت گرمی ہے۔"

چوہا بھی بیدار ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "آج بہت سردی ہے۔"

پھر وہ دونوں لڑنے لگے۔ اور لڑتے جھگڑتے کچن میں جا پہنچے۔ جہاں لالی (لال مرغی) کام میں مصروف تھی۔ وہ آج بھی ہر روز کی طرح چمک رہی تھی، جیسے روشنی کی شعاع ہو۔

"تم میں سے کون مجھے باہر سے لکڑیاں لا کر دے گا؟ تاکہ میں آگ جلا سکوں۔" لالی نے پوچھا۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" مرغا بولا۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" چوہے نے کہا۔

لالی نے افسوس سے سر ہلایا اور خود جا کر باہر سے لکڑیاں لے آئی۔ اس کے بعد وہ دونوں کی طرف دیکھ کر بولی۔

"لکڑیاں تو میں لے آئی ہوں..... اب تم میں سے کون جا کر دریا سے کیتلی میں پانی بھر کر لائے گا؟" لالی نے پوچھا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" مرغے نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" چوہا بولا۔

لالی نے دُکھ سے ان کی طرف دیکھا اور کیتلی اٹھا کر باہر نکل گئی کچھ دیر بعد وہ دریا سے پانی لے کر واپس آ گئی۔ اس نے کیتلی آگ کے اوپر رکھ دی تاکہ چائے بنا کر ناشتا کیا جائے۔

اس کے بعد وہ دوبارہ ان کی طرف مڑی۔

"پانی بھی میں لے آئی ہوں۔" لالی نے کہا۔ "اب ناشتا کون تیار کرے گا؟" لالی نے پوچھا۔

"میں نہیں کروں گا۔" مرغا بولا۔

"میں نہیں کروں گا۔" چوہا بولا۔

"اس کا مطلب ہے یہ کام بھی مجھے ہی کرنا پڑے گا۔" لالی نے اپنے آپ سے کہا اور ناشتا تیار کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ناشتہ تیار ہو گیا۔ لالی نے ناشتا ٹیبل پر لگا دیا یوں تینوں کرسیوں پر بیٹھ کر ناشتا کرنے لگے۔

ناشتے کے دوران چوہا اور مرغا آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دودھ والا جگ گر گیا اور سارا دودھ ضائع ہو گیا اس کے علاوہ وہ روٹی کے ریزے بھی فرش پہ گراتے رہے۔

لالی نے یہ سوچ کر ان سے پوچھا کہ ہو سکتا ہے اب یہ ایک دوسرے سے لڑنا جھگڑنا بند کر دیں اور میرے ساتھ کام میں ہاتھ بٹائیں۔

"تم میں سے کون دودھ صاف کرے گا اور فرش سے ریزے اٹھائے گا؟" لالی نے پوچھا۔

"میں صفائی نہیں کروں گا۔" مرغا بولا۔

"میں صفائی نہیں کروں گا۔" چوہا بولا۔

"یہ بھی مجھے ہی کرنا پڑے گا۔" لالی نے اپنے آپ سے کہا۔

پھر لالی نے کپڑے سے دودھ صاف کیا اور کمرے میں جھاڑو بھی دی۔ اس کے بعد اس نے کچن کی بھی صفائی کی۔

شام کو لالی نے ان سے پوچھا۔ "بستر لگانے میں کون میری مدد کرے گا؟"

"میں نہیں کروں گا۔" چوہا فوراً بولا۔

"میں نہیں کروں گا۔" مرغے نے بھی انکار کر دیا۔

"پھر تو مجھے ہی کرنا پڑے گا۔" لالی بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ جبکہ دونوں ست آرام کرسی پر بیٹھے آگ تاپتے رہے۔

جب بستر لگ گئے تو دونوں ست، (چوہا اور مرغا) بستروں میں جا گھسے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ گہری نیند سو رہے تھے۔

..... ○ ..... ○ .....

دونوں پہاڑیوں کا درمیانی فاصلہ طے کرنے میں پورا ایک دن خرچ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لومڑی جب ان کے گھر تک پہنچی تو رات ہو چکی تھی۔ اور وہ سو چکے تھے۔ اگر وہ باہر ہوتے تو وہ بڑی آسانی سے انہیں پکڑ لیتی۔ مگر اب یہ کام بڑا مشکل دکھائی دیتا تھا۔ لومڑی نے کافی دیر تک سوچا۔ مگر کوئی ترکیب اس کے ذہن میں نہ آئی۔

تب اس نے عافیت اسی میں جانی کہ فی الحال سو جائے اور صبح کو کوئی ترکیب آزمائے۔

ان کے گھر کے پیچھے ایک باغ تھا۔ چھوٹا سا، خوب صورت سا۔ اس میں ایک کونے پر ایک چھوٹا سا تنکوں اور چھپر سے بنا ہوا ایک کمرہ تھا۔ لومڑی اسی میں چلی گئی اور اپنی ہی بوری میں گھس کر سو گئی۔

صبح جلدی ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس وقت بھی اندھیرا ہی تھا۔

جاگتے ہی اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی وہ خوشی سے اچھلی اور بوری اٹھا کر لالی کے گھر کے قریب جا پہنچی۔

"ٹھک ٹھک ٹھک ..... ٹھک ٹھک ٹھک ....." لومڑی نے دروازے پر دستک دی۔

دروازے کے ساتھ والے کمرے میں دو پلنگ تھے۔ ایک پر چوہا سویا ہوا تھا اور دوسرے پر مرغا جبکہ لالی اس سے اگلے کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔ اب چونکہ دستک کی آواز زیادہ بلند نہ تھی۔ لہٰذا یہ آواز صرف چوہے اور مرغے نے ہی سنی۔

آواز سن کر دونوں جاگ گئے۔

"کون ہو سکتا ہے؟" چوہے نے آنکھیں

ملتے ہوئے کہا۔

"اگر جاننا ہی چاہتے ہو تو خود اٹھ کر دیکھ لو۔" مرغے نے منہ بنا کر کہا۔

"شاید یہ ڈاکیا ہے۔" چوہا قیاس آرائی کرتے ہوئے بولا۔ "جو میرے لئے خط لے کر آیا ہو گا۔"

"میرا بھی خط آنے والا ہے..... ہو تو میرا بھی لے لینا۔" مرغا بولا۔

"میں تمہارا نوکر نہیں ہوں۔" چوہا ناک بھوں چڑھا کر بولا۔ "خط لینا ہے تو خود اٹھنا پڑے گا۔"

چوہا بستر سے باہر آیا اور بغیر سوچے سمجھے کہ باہر کون ہے؟ دروازے کی کنڈی کھول دی۔

جیسے ہی دروازہ کھلا، لومڑی چھلانگ مار کر اندر آ گئی اور فوراً دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی لگا دی۔

لومڑی کو دیکھ کر چوہے اور مرغے کی چیخیں نکل گئیں۔

چوہا ڈر کر کونے میں پڑے ڈبوں کی طرف بھاگا۔ جبکہ مرغا بستر سے نکل کر آرام کرسی کی طرف لپکا۔

چوہے کے منہ سے نکلا۔ "چی چی چیں..... چیں چیں....."

مرغا چلایا۔ "کو کوک ..... کک کک کوک....."

لومڑی مسکرائی اور ایک ہی جست میں مرغے تک پہنچی اور اسے بڑی پھرتی سے گردن سے پکڑ کر بوری میں ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ کونے میں چھپے چوہے کو دُم سے پکڑ کر باہر کھینچ لائی پھر اسے بھی بوری میں ڈال دیا۔

اسی وقت لالی گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اندر کیا ہو چکا ہے؟"

"کیا ہوا ؟ ..... کیا ہوا؟" لالی نے پوچھا۔

لومڑی نے بڑے آرام سے اسے پکڑا اور پکڑ کر اسے بھی بوری میں ڈال دیا۔ پھر اس نے بوری کے منہ کو ایک مضبوط رسی سے باندھ دیا اور کچن میں پڑا دودھ پی کر وہاں سے واپس چل پڑی۔

اس وقت تک سورج طلوع ہو چکا تھا۔

رستے میں وہ کیک کھاتی جا رہی تھی، جو وہ ان کے گھر سے اٹھا کر لائی تھی اور کھی کھی کرتی جا رہی تھی۔

دوپہر تک وہ تھک چکی تھی۔ اس پر اس خوراک کا اثر بھی تھا، جو اس نے کھائی تھی۔ لہٰذا اسے نیند آنے لگی۔ مگر وہ نیند کو بھگاتی رہی، اور چلتی رہے۔

اب بوری کے اندر کا حال سنئے!

"میرا خیال ہے، مجھے اتنا غصہ نہیں کرنا چاہئے، اتفاق سے رہنا چاہئے تھا۔" چوہا افسوس

کرتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے مجھے اتنا بست اور خود غرض نہیں ہونا چاہئے، اتفاق سے رہنا چاہئے تھا۔" مرغا پشیمان ہو کر بولا۔

"اب بھی کچھ نہیں بگڑا، بہت کچھ ہو سکتا ہے۔" لالی نے کہا۔ "افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھو! یہ میرا بٹوہ ہے۔"

اس نے انہیں اپنا بٹوا دکھایا۔ "اس میں ایک قینچی ہے، ایک چھوٹا سا انگشتانہ ہے ایک سوئی ہے اور دھاگا بھی ہے۔"

"ان کو کیا کریں؟" مرغا بولا۔

"کیا کریں پھر؟" چوہے نے پوچھا۔

"ابھی پتا چل جائے گا۔ ذرا موقع ملنے دو۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔

لومڑی نیند سے لڑتی، چلی جا رہی تھی پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔

"اس نے بوری کمر سے اتاری اور کچھ دیر آرام کرنے کی نیت سے ایک گھنے درخت کے نیچے لیٹ گئی۔

کچھ دیر بعد اس کے خراٹے گونجنے لگے۔

خراٹوں کی آواز سن کر لالی نے قینچی نکالی اور بوری کو کاٹنا شروع کیا۔ جلد ہی اس نے ایک چھوٹا سا سوراخ بنا دیا۔ وہ سوراخ اتنا تھا جس میں سے چوہا آسانی سے گزر سکے۔

"جلدی کرو!" لالی نے چوہے کے کان میں سرگوشی کی۔ "اس سوراخ سے باہر جاؤ۔ اور جلدی سے ایک پتھر اٹھا کر لاؤ۔ وہ پتھر اتنا بڑا ہو، جتنے کہ تم خود ہو..... جاؤ جلدی کرو!"

چوہا فوراً سوراخ سے باہر نکل گیا۔

چند لمحوں بعد وہ اپنے سائز کا ایک پتھر لے آیا۔

"سوراخ سے اندر پھینک دو!" لالی نے سرگوشی میں کہا۔ چوہے نے پھرتی سے وہ پتھر سوراخ سے اندر ڈال دیا۔ تب لالی نے ایک اور سوراخ بنایا۔ یہ سوراخ اتنا بڑا تھا، جس میں سے مرغا آسانی سے گزر سکے۔

"جلدی کرو!" لالی نے مرغے کے کان میں سرگوشی کی۔ "اس سوراخ سے باہر نکل جاؤ اور ایک پتھر اٹھا کر لاؤ، اتنا بڑا، جتنے کہ تم خود ہو، جاؤ جلدی کرو۔" مرغا فوراً سوراخ سے باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد وہ اپنے سائز کا پتھر لے آیا۔

"سوراخ میں سے اندر پھینک دو!" لالی نے سرگوشی کی۔ مرغے نے جلدی سے وہ پتھر سوراخ سے اندر ڈال ڈیا۔ اس دوران لالی ایک اور سوراخ بنا چکی تھی، جس میں سے وہ خود باہر نکلی اور اپنے سائز کا پتھر لے کر بوری میں ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے قینچی بٹوے میں رکھی۔ سوئی میں دھاگا ڈالا اور انگشتانہ انگوٹھے میں پہن کر تیزی سے وہ ٹکڑے بوری کے ساتھ دوبارہ جوڑنے لگی جو اس نے کاٹے تھے۔

کچھ دیر بعد بوری کے سوراخ بند ہو چکے تھے۔

"اب چپکے سے یہاں سے بھاگ لو۔" لالی نے کہا اور وہ تیزی سے وہاں سے کھسک گئے۔

وہ تینوں بھاگتے ہوئے گھر پہنچے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی، کھڑکیوں کے شٹر گرائے، پردے آگے کئے اور آرام سے ..... اتفاق سے اندر بیٹھ گئے۔ اب وہ محفوظ تھے۔

دوسری طرف لومڑی، کافی دیر سونے کے بعد بالآخر جاگ اٹھی۔

اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور گھاس پر لمبے لمبے سایوں کو دیکھ کر چونک اٹھی۔

"ارے! یہ تو کافی دیر ہو گئی ہے، اب مجھے گھر پہنچنے کے لئے تیزی سے چلنا ہوگا۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔

وہ پھرتی سے بوری اٹھا کر وہاں سے چل پڑی۔

اب اس کی رفتار کافی تیز تھی۔

اس کے رستے میں ایک دریا بھی آتا تھا۔ جب وہ دریا کا پل پار کر رہی تھی تو بوری کا ایک سوراخ کھل گیا۔

ایک پتھر نکل کر اس کے پاؤں میں جا گرا اور لومڑی اس سے ٹھوکر کھا کر گری اور بوری سمیت سیدھی دریا میں جا گری جہاں خونخوار مچھلیاں تیزی سے اس کی طرف لپکیں۔

"مم ..... مجھے معاف کر دو مم ..... مجھے مم ..... مت کھاؤ!" لومڑی خوف زدہ ہو کر چیخی۔

"تم ظالم ہو!" ایک مچھلی بولی۔

"تم لالچی ہو!" دوسری مچھلی نے کہا۔

"تم خود غرض ہو!" تیسری مچھلی غرائی۔

"کیا تم نے لالی، مرغے اور چوہے کو معاف کیا جو ہم تمہیں معاف کر دیں؟" چوتھی مچھلی نے کہا۔

"تم ان کو کھانا چاہتی تھیں، اب ہم تمہیں کھائیں گے۔" پانچویں مچھلی نے دانت کچکچا کر کہا۔

"مجھ پر رحم کھاؤ! ..... مجھ پر رحم کھاؤ!" لومڑی نے منت کی۔

"تم نے کبھی کسی پر رحم کھایا؟" ایک اور مچھلی بولی۔

اس کے بعد سب مچھلیوں نے مل کر اس پر حملہ کر دیا اور آناً فاناً اس کی بوٹی بوٹی نوچ لی۔

دیکھا بچو! لومڑی نے جیسا کیا، ویسا بھرا ..... اور اس دن اس کے بچے بھی بھوکے رہے۔

دوسری جانب لالی، چوہا اور مرغا آج بہت خوش تھے۔ انہوں نے آج لالی کو آرام سے کرسی پر بٹھا دیا تھا اور خود دونوں مل کر کام کر رہے تھے۔ اب وہ نہ تو جھگڑ رہے تھے، نہ خفا ہو رہے تھے، نہ بد تمیزی کر رہے تھے بلکہ خوش خوش کام کر رہے تھے۔

"آج تمہیں کرسی سے ہلنا نہیں ہے۔" چوہا بولا۔ "آج تمہارے آرام کا دن ہے۔"

"ہاں! آج تمہارے آرام کا دن ہے۔" مرغا تائید میں بولا۔ "اور آج سے تم ہماری آپا ہو ..... آپا جی!" وہ مسکرایا۔

"آپا جی!" چوہے نے نعرہ لگایا۔

"زندہ باد!" مرغا بلند آواز سے بولا۔

جواب میں لالی مسکرا کر بولی۔ "میرے ساتھی! ..... زندہ باد!"

اس دن کے بعد وہ پھر کبھی نہ جھگڑے اور نہ کبھی انہیں کسی لومڑی نے تنگ کیا۔

کیا آپ ناراض ہیں؟

اگر آپ

- اس لئے ناراض ہیں کہ آنکھ مچولی میں بھیجی ہوئی تحریر شائع نہیں ہوئی تو ذرا سوچیئے کہ ایسا کیوں ہوا؟
- کیا آپ کی تحریر نقل شدہ تھی۔؟
- پہلے شائع ہو چکی تھی؟
- صفحے کے دونوں طرف اور لائن چھوڑے بغیر لکھی گئی تھی۔
- پنسل سے یا اتنے مشکل رسم الخط میں لکھی گئی تھی کہ پڑھی نہیں جا رہی تھی؟
- چھوٹے پرزوں پر لکھی گئی تھی؟
- ایک ہی صفحے پر بہت سی تحریریں لکھی گئی تھیں؟
- آپ کی تحریر کا انداز بیان، خیال اور اسلوب بچوں کی نفسیات سے ہٹ کر تھا؟
- آپ کی تحریر مشکل اور گنجلک تھی؟
- آپ کی تحریر میں مقصدیت کا فقدان تھا۔؟
- تو پھر سوچیے کہ آپ کی تحریر کیونکر شائع ہو سکتی تھی۔
- اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر شائع ہو تو اوپر بیان کی گئی تمام باتوں سے بچیں۔
- یاد رکھیئے! بڑا ادیب بننے کے لئے مطالعہ اور مسلسل محنت بہت ضروری ہے۔

(ادارہ)

بلّی کا خواب

محمد بن مالک

ایک بلی نے خواب یہ دیکھا
بیچ میدان محل ہے اونچا
اس میں دربار بھی ہے عمدہ سا
خود کو بلی نے تخت پر پایا
سامنے با ادب کھڑے تھے وزیر
ایک جانب کئی سفیر و مشیر
دل میں بلی نے بات یہ سوچی
میری قسمت ہے کس قدر اچھی
عیش کرنا مرا مقدر ہے
مال و دولت مجھے میسّر ہے
جو بھی چاہوں گی خوب کھاؤں گی
اپنے من کی مراد پاؤں گی
سامنے جو وزیر اعظم تھا
رانی بلی نے اس سے فرمایا
"بھوک ہم کو بہت ستاتی ہے
یاد چوہوں کی دل میں آتی ہے
چھیچھڑے لاؤ جا کے اچھے سے
اور چوہے ہوں ساتھ موٹے سے
تخت پر ہم طعام کھائیں گے
اپنے دل کی مراد پائیں گے"
حکم سن کر وزیر اعظم نے
سر جھکا کر کہا یہ بلی سے
"محل میں ہیں پلاؤ، بریانی
قورمہ کھا کے پیجیے پانی
چھیچھڑوں کا خیال ہے معیوب
کیوں ہیں چوہے جناب کو مرغوب؟
شاہی اطوار آپ اپنائیں
عمدہ کھانوں کو شوق سے کھائیں"
سلسلہ خواب کا یہیں ٹوٹا
بولی بلی یہ خواب ہے جھوٹا
ایسی شاہی سے میں تو باز آئی
جس میں اپنی غذا نہیں پائی
خواب اچھا اسے
میں سمجھوں گی
چھیچھڑے جس میں
خوب دیکھوں گی

ماحولیاتی آلودگی کا خاتمہ کیجئے

PREMIER Plus

پریمیئر پلس استعمال کیجئے

واحد گیسولین جس میں سیسے کی آمیزش نہایت کم ہے۔ اب ملک بھر میں دستیاب ہے

- دھوئیں کے اخراج پر بہتر کنٹرول
- اعلیٰ کارکردگی
- بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ

PSO پاکستان اسٹیٹ آئل

آپ کی صحت ہماری اوّلین توجہ

PARAGON

کہانی انسان کی

تیسری قسط

اسحاق منصوری

ظالم بادشاہ کے ڈر سے ماں نے اپنے بچے حیؑ کو ایک صندوق میں بند کر کے سمندر کی لہروں کے حوالے کردیا۔ لہریں صندوق کو جزیرہ واقواق کے گھنے جنگل میں چھوڑ آئیں۔ یہاں ایک ہرنی نے اس بچے کو اپنے گم شدہ بچے کی جگہ پرورش کرنا شروع کیا۔ وہ اسے اپنا دودھ پلاتی، گرمی سردی سے بچاتی، اور پیار و محبت سے چومتی چاٹتی۔ بچہ بھی ہرنی سے بہت پیار کرتا۔ وہ اس کے بغیر تھوڑی دیر بھی نہیں رہتا تھا۔ جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو ہر وقت ہرنی کے ساتھ ساتھ رہنے لگا۔ اب وہ دودھ کے علاوہ دیگر جنگلی پھل بھی کھانے لگا تھا۔ اس کی دوستی جنگلی گائے کے ایک ریوڑ سے بھی ہوگئی تھی۔ بچہ ہرن اور جنگلی گائے کی آواز کی نقل بھی اتارتا تھا۔ بلکہ وہ جنگل میں موجود تمام جانوروں اور پرندوں کی آوازوں کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا۔ خاص طور پر وہ ہرنی کی آوازوں کی زیادہ نقل کرتا تھا۔ مدد کے لئے بلانے کی آواز الگ تھی۔ پیار و محبت کی آواز الگ تھی۔ بھوک اور پیاس کی آواز الگ تھی۔ حیؑ تمام جانوروں کی آوازوں اور بولیوں سے مانوس ہوچکا تھا۔ جانور اور پرندے بھی اس سے مانوس ہوچکے تھے۔ وہ جانوروں اور پرندوں کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ بعض جانور اور پرندے اچھے لگتے تھے جیسے مور۔ اور بعض پرندے اور جانور اسے اچھے نہیں لگتے تھے جیسے بندر۔ وہ اپنے جسم کے بارے میں اور درختوں کے بارے میں سوچتا۔ وہ زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔۔۔۔ کافی بیمار رہنے کے بعد ایک دن ہرنی مرگئی۔ تب اس نے موت کے بارے میں بھی سوچا۔ (اب آپ آگے پڑھیے)

امید اور خوف

وہ یہ سوچتا تھا کہ اس کا یہ کام اس مصیبت سے کسی بہت بڑی مصیبت میں گرفتار نہ کردے۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ کہیں میرا یہ کام ہرنی کے ساتھ بھلائی کے بجائے برائی نہ بن جائے اور ہرنی کو زندگی دینے کے بجائے موت کا سبب نہ بن جائے میں کیا کروں؟ ہو سکتا ہے کہ جب میں اس کا سینہ چیروں تو یہی اس کی موت کا سبب بن جائے! اس طرح اس کی زندگی کی امید ہی ختم ہو جائے۔ پھر اس نے سوچا اور بہت دیر تک سوچتا رہا اور اپنے آپ سے پوچھتا رہا کہ کیا اس نے ہرنی کے سوا کسی اور جانور کو اس حالت میں دیکھا ہے اور پھر وہ جانور دوبارہ زندہ ہو گیا ہو تب اس نے سوچا کہ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ اب اس نے سوچا کہ اگر اس نے ہرنی کو اسی حال میں چھوڑ دیا تو وہ دوسرے جانوروں کی طرح پڑی پڑی ختم ہو جائے گی۔ البتہ اگر وہ اس چھپے ہوئے عضو کو تلاش کر لیتا ہے تو دوبارہ اس ہرنی کے زندہ ہو جانے کا امکان ہے۔

ہرنی کا آپریشن

اب حیّ نے ہرنی کا آپریشن کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کا سینہ چیرنے کی بات طے ہو گئی تاکہ سینے میں جو کچھ ہے اس کی تحقیق کی جا سکے۔ اس نے اپنے اس فیصلے کو نافذ کرنے میں ذرا بھی شک و شبہ سے کام نہیں لیا۔ اس نے نوک دار سخت پتھر اٹھائے اسی طرح چھری جیسی سوکھی ہوئی لکڑیوں کے ٹکڑے لے لئے۔ اس نے ہرنی کے دونوں بازو کاٹ دیئے۔ اس کا دل کامیابی کے لئے بے چین و بے قرار تھا۔ جب وہ سینے کے پاس پہنچا تو اسے احساس ہوا کہ یہاں کوئی سخت چیز ہے۔ اب اس کا یہ خیال یقین میں بدلنے لگا کہ اتنی زیادہ سخت حفاظت لازماً اسی اہم عضو کی کی جا رہی ہے جو پورے جسم میں زندگی کی روح دوڑا رہا ہے اب اسے یہ خیال آنے لگا کہ جب وہ اس سخت چیز سے آگے بڑھے گا تو وہ اس منزل کو پالے گا جس کی اسے تلاش ہے۔ اب اس نے اس پردے کو چھیڑنے کی کوشش کی۔ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کے لئے اپنی اس ضرورت کی تکمیل بہت مشکل ہو گئی کیونکہ اس کے پاس ایسے آلات نہیں تھے جن سے وہ یہ کام لے سکتا۔ اس کے پاس تو صرف نوک دار پتھر اور لکڑیاں تھیں۔ لیکن حیّ نے قسم کھائی کہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کر کے رہے گا اسے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ اب اس نے پتھروں کو تیز کیا اور اس کی کھال کو بڑی ہنرمندی سے کاٹنے

لگا۔ یہاں تک کہ اس میں ایک سوراخ ہوگیا اب وہ پھیپھڑوں تک پہنچ گیا۔ پھیپھڑوں کو دیکھتے ہی اس نے یہ سمجھا کہ یہی وہ مخصوص عضو ہے اب وہ اسے بار بار الٹنے پلٹنے لگا تاکہ اس جگہ کو دیکھ لے جہاں اسے کوئی بیماری یا تکلیف پہنچی ہے تاکہ اسے دور کردے۔ اگر کوئی رکاوٹ آگئی ہے تو اس رکاوٹ کو بھی وہ ہٹا سکے۔

ہرنی کا دل

پھیپھڑوں کے اوپر سینے میں اس نے دل کو دیکھا جو ایک جھلی میں لپٹا ہوا تھا دل کے آس پاس ایسی چیزیں بھی موجود تھیں جو اس کی حفاظت کررہی تھیں۔ اس نے سوچا کہ یہی وہ عضو ہے جس کی مجھے تلاش ہے۔ اس عضو میں بڑی حرارت اور طاقت محسوس ہوتی ہے۔ پھر اس نے اپنے دل میں کہا کہ یہ عضو جسم کے بیچ میں پایا جاتا ہے۔ بڑے خوبصورت انداز میں بنا ہوا ہے۔ اس میں کہیں ٹکڑے نہیں ہیں۔ یہ گوشت بھی زیادہ سخت محسوس ہوتا ہے اس عضو کی طرح اور کوئی عضو اتنی حفاظت سے کسی غلاف میں لپیٹ کر نہیں رکھا گیا ضرور یہی وہ چیز ہے جس کی مجھے تلاش ہے اب اس نے دل کی جھلی کو ہٹا کر اسے اندر سے دیکھنے کا فیصلہ کیا بہت کوشش کے بعد وہ اس جھلی کو ہٹانے میں کامیاب ہوگیا۔

دل کا آپریشن

اب اس نے بڑی احتیاط سے دل کو وہاں سے کاٹ کر الگ کرلیا۔ اسے شروع میں ایسا محسوس ہوا کہ اس دل کے اندر کوئی خالی جگہ نہیں ہے۔ اس نے دل کو بڑے غور سے دیکھا مگر ظاہری طور پر اسے کوئی بیماری نظر نہیں آسکی۔ اس نے اپنا ہاتھ دل پر رکھا اور مختلف جگہوں سے جب دبا کر دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ دل میں خالی جگہ موجود ہے۔ حیّ نے اپنے دل میں کہا "شاید میرا مقصد اسی عضو کے اندر موجود ہے۔ اب میں جلد ہی اسے پالوں گا" جیسے ہی اس کے دل میں یہ خیال آیا اس نے دل کو چیر ڈالا وہ کیا دیکھتا ہے کہ دل میں دو خالی جگہیں ہیں۔ ایک اس کے دائیں طرف ہے اور دوسری خالی جگہ اس کے بائیں طرف ہے۔ پہلے حیّ نے دائیں طرف کی خالی جگہ کو دیکھا وہ جمے ہوئے خون کے ٹکڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ پھر اس نے بائیں طرف کو دیکھا دل کا یہ حصہ بالکل خالی تھا۔ اب حیّ نے سوچا کہ جس چیز کی مجھے تلاش ہے وہ لازماً ان دونوں میں سے کسی ایک میں موجود ہے۔ کچھ سوچ کر اس نے اپنے آپ سے کہا کہ جہاں تک اس دائیں جگہ کا تعلق ہے جس میں

خون کے ٹکڑے جمے ہوئے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب سارا جسم بے حس و حرکت ہوگیا تو اس حصے نے بھی اپنا کام کرنا چھوڑ دیا۔

اب حیّ کو یہ خیال آنے لگا کہ شاید وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ جب بھی کسی جسم سے خون کو نکلتے دیکھا تو وہ جم جاتا ہے اس خون کا بھی یہی معاملہ لگتا ہے مجھے تو دل میں زندگی کے اس پوشیدہ راز کی تلاش ہے جس کے نتیجے میں سارا جسم حرکت کرتا ہے۔ وہ دھڑکتا ہوا دل جو زندگی کا سرمایہ ہے اس جمے ہوئے خون سے مجھے کچھ سروکار نہیں۔ یہ زندگی کا راز نہیں ہوسکتا۔ کتنی بار ایسا ہوا کہ جانوروں نے مجھے زخمی کردیا اور میرے جسم سے بہت سا خون بہہ گیا لیکن اس کے باوجود مجھ پر یہ کیفیت طاری نہیں ہوئی جو اس ہرنی پر طاری ہے اور نہ ہی میرے اعضا اس طرح بے حس و حرکت ہوگئے۔ جہاں تک دل کے دائیں جانب کا تعلق ہے جس میں خون جما ہوا ہے اس میں میرا مطلوب و مقصود نہیں ہے البتہ دل کے بائیں جانب کو میں خالی دیکھ رہا ہوں اس میں میرے کام کی کوئی چیز نظر نہیں آرہی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس خالی جگہ میں کوئی چیز نہیں تھی جو یہاں سے رخصت ہوگئی ہو اور دل کا یہ حصہ بے کار پیدا نہیں کیا گیا کیوں کہ جسم کے ہر عضو کو کسی نہ کسی کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے پھر یہ جگہ کیوں خالی ہے۔ بے شک یہ جگہ اس طاقت کا مرکز ہے جو پورے جسم کو حرکت و حرارت فراہم کررہی ہے۔ اب اس کے رخصت ہوجانے سے پورا جسم ساکن ہوگیا اور اس قوت کے جسم سے نکل جانے کے بعد اس جسم کی کوئی قدر و قیمت اور اہمیت باقی نہیں رہی۔ کافی سوچ بچار کے بعد حیّ کو یہ یقین ہوگیا کہ اس کی وہ انتہائی پیاری ماں جس نے اسے پیار و محبت سے پروان چڑھایا وہ اس جسم سے رخصت ہوگئی ہے۔ وہ تو اس پوشیدہ طاقت میں موجود تھی جو اس جسم کو حرکت و حرارت فراہم کررہی ہے۔

حیّ اس نتیجے پر پہنچا کہ انسانوں اور دوسرے حیوانات کے جسم کی مثال لاٹھی کی طرح ہے جسے انسان کا ہاتھ کام میں لاتا ہے۔

میت کی تدفین

اس طرح ہرنی کا جسم سرد ہوگیا اور اس سے بدبو نکلنے لگی اور اب حیّ پریشان ہوا وہ بدبو سے بیزار ہوکر سوچ رہا تھا کہ اس مردہ کو کس طرح دفن کیا جائے؟ اسی پریشانی کی حالت میں اس نے دو کوؤں کو لڑتے ہوئے دیکھا کہ کافی لڑائی کے بعد ایک کوّا مرگیا دوسرے کوے نے زمین کا ایک

چکر لگایا پھر ایک جگہ پر ایک گڑھا کھودا اور اس مردے کو لے کر گڑھے میں ڈال کر اس پر مٹی ڈال دی۔ اب حیّ نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ کوّا مجھ سے کتنا اچھا ہے اس نے کتنی عمدگی سے مردہ ساتھی کو دفن کردیا جبکہ اس سے پہلے ان دونوں میں لڑائی بھی ہوچکی تھی۔ میں کتنا بے وقوف ہوں کہ مجھے اپنی ماں کو دفن کرنا بھی نہیں آتا اس کوّے کو دیکھ کر مجھے پتہ چلا کہ اس ہرنی کو کس طرح سے دفن کیا جائے۔ اب حیّ نے جلدی سے ایک گڑھا کھودا اور انتہائی ادب و احترام سے اپنی ماں کے مردہ جسم کو اس میں رکھ کر اس نے مٹی ڈال دی۔

جزیرے کی سیر

اب حیّ مسلسل اسی چیز کے بارے میں سوچتا رہا جس نے اس کی ماں کے جسم کو بے حس و حرکت کردیا تھا وہ روح جو جسم میں زندگی کا راز ہے جب جسم سے رخصت ہوتی ہے تو جسم بیکار ہوجاتا ہے اور اس کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی حیّ اسی طرح مسلسل روح کے بارے میں سوچتا رہا لیکن اسے پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کیا چیز ہے بلکہ اس پر پریشانی چھائی رہی۔ اس نے بے شمار ہرنیوں کو دیکھا کہ وہ سب کی سب اپنی شکل وصورت میں اس کی ماں کی طرح ہیں وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ تمام ہرنیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ اسی طرح جو چیز اس کی ماں میں قوت و حرارت کا سبب تھی وہی چیز ان سب ہرنیوں کی حرکت وحرارت کا سبب ہے اب اسے تمام ہرنیوں سے محبت ہوگئی وہ ان ہرنیوں کو خوب پیار کرتا کیوں کہ وہ سب ہرنیاں اس کی ماں کی شکل وصورت جیسی تھیں۔ حیّ اسی طرح کئی سالوں تک اس جزیرے میں گھومتا پھرتا رہا۔ وہاں وہ مختلف جانوروں اور درختوں کو دیکھتا کبھی جزیرے کے ساحل پر چلا جاتا اس کے دل میں چھپی ہوئی خواہش تھی کہ کیا اس جزیرے میں مجھ جیسی بھی کوئی مخلوق پائی جاتی ہے جیسے ہر جانور جیسے بے شمار جانور اور ہر درخت جیسے بے شمار درخت موجود ہیں۔ اسے کافی تلاش اور جستجو کے باوجود اپنی شکل وصورت جیسا کوئی نہ مل سکا۔ اسے جزیرے کے چاروں طرف دور دور تک نیلگوں پانی موجیں اٹھاتا ہوا نظر آتا۔ اسے کبھی کبھی یہ خیال آتا کہ یہ جزیرہ ہی ساری کائنات ہے۔

آگ کی دریافت

ایک دن اچانک لمبی جھاڑیوں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے جب اس کی نظر آگ پر پڑی تو اسے یہ بڑی عجیب چیز معلوم ہوئی۔ کچھ دیر کے لئے اس پر خوف کی کیفیت طاری ہوگئی۔ ایسی

انوکھا درخت

امریکہ کے جنگلوں میں ایک ایسا درخت ہے کہ جب کوئی جاندار اس کے قریب جاتا ہے اس کی شاخیں اس کے جسم کے ساتھ لپٹ جاتی ہیں اور آہستہ آہستہ اسے کھا جاتی ہیں۔

مرسلہ: محمد اختر سردار، کسووال۔

عجیب و غریب چیز اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔اب وہ آہستہ آہستہ آگ کے قریب آنے لگا۔جب آگ کے قریب پہنچا تو آگ سے نکلنے والی روشنی اور تپش پر غور کرنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ آگ کی لپیٹ میں آنے والی ہر چیز فنا کے گھاٹ اتر کر راکھ بن جاتی ہے۔ اب اس کی دہشت میں مزید اضافہ ہوگیا حیّ کی طبیعت میں اللہ تعالیٰ نے جرأت اور حوصلہ مندی کوٹ کوٹ کر بھردی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ آگ میں ڈال کر ایک انگارہ اٹھانا چاہا۔ لیکن آگ کو ہاتھ لگاتے ہی اس کا ہاتھ جھلس گیا اور وہ انگارے کو اٹھانے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔

آگ کا فائدہ

پھر اس نے ایسی لکڑی دیکھی جو ہر طرف سے جلی ہوئی نہیں تھی جہاں سے لکڑی کو آگ نے نہیں پکڑا تھا اس طرف سے اس نے لکڑیوں کو اٹھالیا۔دوسری طرف آگ جل رہی تھی اِسی طرح وہ آسانی سے آگ کو اس جگہ لے جانے میں کامیاب ہوگیا جسے اس نے اپنا ٹھکانہ بنایا ہوا تھا۔ حی اکیلا ایک غار میں رہتا تھا اسے اپنی رہائش کے لئے یہی جگہ اچھی لگی۔ اس نے اس جلتی ہوئی لکڑی کو ایک کونے میں رکھا اور اس پر سوکھی گھاس اور بڑی بڑی لکڑیاں ڈالتا رہا اس طرح سے یہ آگ دن و رات جلتی رہی۔ حیّ چاہتا تھا کہ آگ ہمیشہ جلتی رہے۔ اسے یہ آگ بہت اچھی لگتی تھی۔ خاص طور پر رات کو آگ سے اس کی محبت بڑھ جاتی تھی۔ کیوں کہ رات میں وہ سورج کی جگہ روشنی بھی فراہم کرتی تھی اور گرمی کا بھی ایک مؤثر ذریعہ ثابت ہورہی تھی۔ آگ سے اس کی محبت بڑھ گئی وہ یہ سوچنے لگا کہ میرے پاس جو چیزیں ہیں ان میں یہ سب سے زیادہ فائدہ مند ہے۔

آگ کی طاقت

حیّ نے دیکھا کہ آگ ہمیشہ اوپر کی طرف جاتی ہے اسے یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید اس کا تعلق بھی ان آسمانی چیزوں سے ہے جنہیں وہ آسمان پر چمکتا ہوا دیکھتا ہے اِس نے دیکھا کہ آگ میں جو چیز ڈالی جاتی ہے وہ جل کر ختم ہوجاتی ہے اور آگ اس پر غالب آجاتی ہے۔

(جاری ہے)

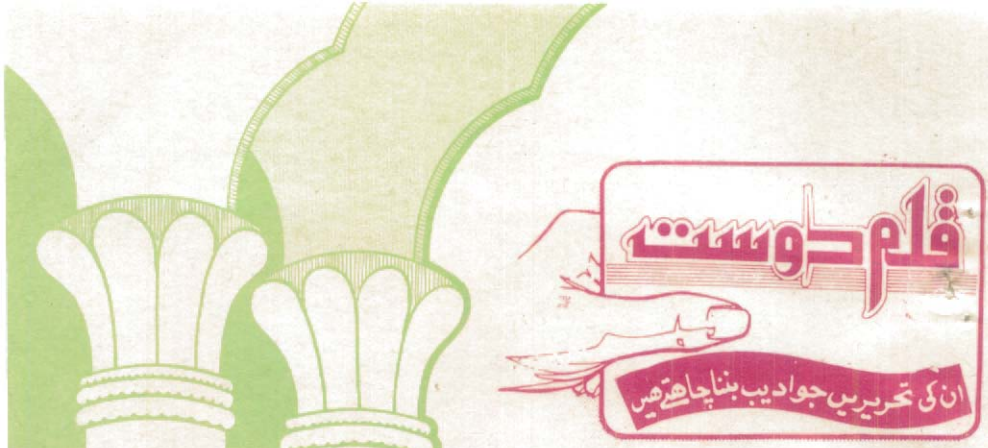

قلم دوست

ان کی تحریریں جو ادیب بننا چاہتے ہیں

روشنی

محمد سلیم امام

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں میں نے دریا کے کنارے ایک درویش کو دیکھا جس کے بدن پر ایک زخم تھا جو کسی دوا سے اچھا نہ ہوتا تھا۔ مدتوں اس بیماری میں مبتلا رہا مگر برابر خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کرتا رہتا۔ اس سے پوچھا گیا کہ تو کس بات کا شکر ادا کرتا ہے؟ جواب دیا "شکر اس بات کا ہے کہ میں مصیبت میں گرفتار ہوں گناہ میں نہیں۔" سچ ہے اللہ کے بندے گناہ کے مقابلے میں مصیبت کو پسند کرتے ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

صدف مظفر
راولپنڈی

کرو بچّو سدا حمد اس خدا کی
سنہرا جس نے سورج کو بنایا
زمین میں جس نے رکھا ہے خزانہ
اسی نے دی ہے سبزے کو یہ نرمی
چمن اس نے کِھلائے لہلہاتے
اسی کے حکم میں ہے سارا عالم
اسی کو ساری دنیا مانتی ہے
اسی کو اپنا خالق جانتی ہے

ہمیں یہ زندگی جس نے عطا کی
رو پہلا چاند جس نے جگمگایا
خزانہ جس سے پلتا ہے زمانہ
اسی کے بس میں ہے سردی و گرمی
پرند اس نے بنائے چہچہاتے
وہی مالک ہے پورب ہو کہ پچھم

صلۂ شہید کیا ہے

انتخاب — شہلا شرف علوی — کراچی

۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کی صبح جب شبیر شریف کو خون آلود وردی میں گھر لایا گیا تو تب بھی ماں خاموش رہی۔ شبیر کا معمول کا جملہ اس کے ذہن میں گونج رہا تھا: "کچھ نہیں ماں بس ذرا لڑائی ہو گئی تھی۔" آج ماں اس کی قمیض نہیں بدل سکتی تھی کہ شہیدوں کو اپنی کپڑوں میں دفناتے ہیں جن میں وہ شہید ہوں۔۔!!

گرے رنگ کی نیکروں اور سفید قمیضوں میں ملبوس تھکے ماندہ طلبہ بھاری بستوں کا بوجھ اٹھائے بوجھل بوجھل قدموں سے باہر نکل رہے تھے کہ اسکول کی عمارت کے باہر انہوں نے اپنے ساتھیوں کا ایک ہجوم دیکھا، تین سینیئر لڑکوں کے ساتھ ایک چھوٹا لڑکا اکیلا ہونے کے باوجود جھپٹ جھپٹ کر اپنے سے بڑے لڑکوں سے اُلجھ رہا تھا اس لڑکے کی حالت ایسی تھی کہ ناک سے خون بہہ رہا تھا اور سفید اجلی قمیض پر لڑائی کی وجہ سے خون کے دھبے تھے اور دھبوں کی وجہ سے قمیض خراب ہو گئی تھی۔

اسکول کے ایک پریفیکٹ نے آکر ان کا جھگڑا ختم کروایا۔ لڑائی کی وجہ تینوں سینیئر لڑکے تھے جو چھوٹی کلاس کے لڑکوں کو تنگ کر رہے تھے۔ شبیر نے انہیں منع کیا لیکن وہ باز نہ آئے تو چھوٹا ہونے کے باوجود وہ ان سے بھڑ گیا۔ نتائج

سے تو وہ ہمیشہ بے نیاز رہا تھا۔ گھر پہنچا تو ماں خون آلود قمیض دیکھ کر سہم گئی ۔ دوڑ کر بلائیں لیں اور پوچھا کہ کیا ہوا؟ "کچھ نہیں ماں بس ذرا لڑائی ہوگئی تھی۔!!" شبیر نے بے نیازی سے جواب دیا ماں خاموش ہوگئی۔ پھر اکثر اسی طرح ہونے لگا لیکن ماں خاموش ہی رہتی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کبھی غلط نہیں لڑتا۔

۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کی صبح جب شبیر شریف کو خون آلود وردی میں گھر لایا گیا تو تب بھی ماں خاموش رہی۔ شبیر کا معمول کا جملہ اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ "کچھ نہیں ماں بس ذرا لڑائی ہوگئی تھی۔" آج تو ماں اس کی قمیض بھی نہ بدل سکتی تھیں کیونکہ شہیدوں کو انہی کپڑوں میں دفناتے ہیں جن میں وہ شہید ہوں۔

صلہ شہید کیا ہے؟ تب و تاب جاودانہ شبیر شریف کی زندگی جرأت، شجاعت، دلیری اور بہادری کی منہ بولتی داستان تھی۔

شبیر شریف ۲۸ اپریل ۱۹۴۳ء کو کنجاہ میں پیدا ہوئے اس وقت ان کے والد محمد شریف فوج میں تھے جب شبیر اسکول جانے کے قابل ہوئے تو کانونٹ اسکول میں داخل کروا دیئے گئے۔ دسمبر ۱۹۵۰ء کا رزلٹ کارڈ پہلے سالانہ امتحان میں ان کی کارکردگی کا منہ بولتا ثبوت ہے ہر مضمون میں تقریباً" پورے پورے نمبر حاصل کر کے ساڑھے پانچ سو نمبروں میں سے دو کم پانچ سو نمبر حاصل کئے۔

نشانِ حیدر شبیر شریف کی شہادت کا واقعہ

دن کے گیارہ بجے کے وقت سے شروع ہوتا ہے جب بھارتیوں نے ٹینکوں کی مدد سے دوسرا حملہ کیا۔ اس سے پہلے بھارتی توپ خانے نے تقریباً" چار گھنٹے تک زبردست آگ برسائی تھی۔ ۳ دسمبر کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ بھارتی دن کی روشنی میں حملہ آور ہو رہے تھے۔ چاروں طرف سے ٹینک آگے بڑھ رہے تھے۔ میجر شبیر شریف نے خود ۱۰۶ ملی میٹر کی ایک توپ سنبھالی اور تاک تاک کر ٹینکوں کو نشانہ بنانے لگے وہ بڑی جرأت، بہادری اور بے خوفی سے اپنے ساتھیوں کو لڑا رہے تھے کہ اسی دوران ٹینک کا ایک گولہ ان کے قریب آکر پھٹا اور اس زور سے پھٹا کہ میجر شبیر شریف اور ان کے دو ساتھیوں کو کئی فٹ فضا میں اُچھال دیا۔ میجر شبیر شریف کا جسم تو زمین پر آ رہا لیکن روح وہیں قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور میجر شبیر شریف فانی زندگی کو خیرباد کہہ کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرحدی سرحدوں میں داخل ہوگئے۔

ولا تقولو لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لاتشعرون ○

(اور جو اللہ کے راستے میں مارے جائیں انہیں مُردہ نہ کہو۔ وہ تو زندہ ہیں لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں)

کہانی مقابلے کی دوسری انعام یافتہ کہانی

اسی مددگار

ہما عظمت

فائرنگ کی آواز میں شدّت آگئی تو امّی جان کا ہاتھ تسبیح کے دانوں پر جلدی جلدی چلنے لگا۔

"اللہ خیر کرے ...... تمہارے ابو اس فائرنگ میں کام پر گئے ہیں۔" امّی نے رابعہ سے کہا پھر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ "اللہ! سب کو اپنی حفاظت میں رکھ ...... سب کی حفاظت فرما۔ میرے ملک میں امن و سکون عطا فرما۔ ہم سب کو ہدایت نصیب فرما!!" دُعا ختم ہو گئی تو ننھی رابعہ نے کہا۔

"امّی جان! ہدایت مانگنے سے کیا ہدایت مل جا
ہے۔؟"

"اللہ کرے! تمہیں ضرور مل جائے تم میری ک
بات نہیں سُنتی ہو ......"

"امی جان! میں ساری باتیں سُنتی تو ہو
آپ کی۔ چھوٹے بچے تو بڑوں کی بات بھی سُ
لیتے ہیں لیکن بڑے۔ بچے اپنے بڑوں کی باتیں نہ
سُنتے۔ اب یہی دیکھ لیجئے...... فاطمہ خالہ کل رو
کر بتا رہی تھیں کہ ان کا لڑکا بندوق کاندھے

لٹکائے لٹکائے پھرتا ہے اور روز فائرنگ کرتا ہے۔ میں اسے منع کرتی ہوں کہتی ہوں کہ بندوق کی جگہ قلم اُٹھا۔ قلم کے ذریعے لڑ، تو وہ میری نہیں سُنتا....."

ننھی رابعہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر دوسرے ہی لمحے بولی۔ امّی! ابّو کہتے ہیں جو جنگیں قلم سے لڑی جائیں وہ سب سے اچھی ہوتی ہیں۔ کیا واقعی؟"

"دھڑ دھڑ دھڑ!!" اسی وقت دروازہ پیٹا جانے لگا۔

"الٰہی خیر! کون ہے؟"

"بہن جی! دروازہ کھولیں ..... آپ کے شوہر تفضل صاحب کو گولی لگ گئی ہے؟" باہر سے لوگوں کے بولنے کے دوران ایک تیز آواز سُنائی دی۔

"نہیں .....!!" رابعہ کی امّی چلّائیں پھر بھاگ کر دروازہ کھولا۔ سامنے لوگوں کا ہجوم تھا اور کچھ لوگ ان کے شوہر کی خون میں لت پت لاش اٹھائے مجرموں کی طرح سر جُھکائے کھڑے تھے۔

خون میں ڈوبی لاش دیکھ کر رابعہ کی امی بے ہوش ہو گئیں۔ "میرے ابو کو کس نے مارا ہے؟ میرے ابو تو گولیاں نہیں چلاتے تھے میرے ابّو تو سب سے محبت کرتے تھے۔ وہ کسی سے نفرت نہیں کرتے تھے کیوں مارا ہے انہیں .....؟؟" رابعہ رو رہی تھی اور چلّا چلّا کر کہہ رہی تھی۔ مجمع میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ "تفضل صاحب کو آج ڈیوٹی پر جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔" "معلوم ہے حالات خراب ہیں پھر گھر سے باہر نکلنے سے کیا حاصل ہوا سوائے موت کے"۔ "آخر کس نے کہا تھا کہ محاصرے والے علاقے میں سے گزر کر جائیں۔" "ارے! یہاں سے اسٹاپ نزدیک پڑتا ہے۔ ناں!" "بڑے نیک آدمی تھے ان کی بس موت آئی تھی۔ اب ان کے بیوی بچّوں کا کیا ہو گا؟"

"اب کیا ہو گا؟"

"رابعہ کی امی بھی یہی سوچ رہی تھیں۔ تفضل صاحب کو دنیا سے رخصت ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ جو تھوڑا بہت پیسہ تھا وہ ان کے کفن دفن پر لگ گیا تھا۔ اب گھر میں صرف دو دن کا راشن تھا۔

"بڑے نیک آدمی تھے .....ان کی بس موت آئی تھی اب ان کے بیوی بچّوں کا کیا ہو گا؟؟" رابعہ کی امّی کے کانوں میں لوگوں کے جملے گونجنے لگے۔ "ہاں گھر کی دال روٹی اب کیسے چلے گی؟" انہوں نے گھبرا کر سوچا.....رات کے دو بج چکے تھے۔ اور وہ مسلسل سوچے جا رہی تھیں۔ دور کسی گھڑیال نے دو بجنے کا اعلان کیا تو

وہ چونکیں پھر چونک کر انہوں نے دیکھا رابعہ بستر پر نہیں تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھیں اور بیٹھک میں آئیں۔ بیٹھک کی لائٹ جل رہی تھی۔ انہوں نے دیکھا۔ رابعہ میز کے قریب کاغذ پر کچھ لکھتے لکھتے کرسی پر ہی ٹک کر سو گئی تھی۔ دو آنسو اس کے گالوں پر..... نشان چھوڑ گئے تھے۔ رابعہ کی امی اسے نیند سے اٹھانا چاہتی تھیں کہ میز پر پڑے کاغذ کے ٹکڑے کو دیکھ کر چونک اٹھیں۔ رابعہ کی نفیس ہینڈ رائٹنگ پرچے پر جگمگا رہی تھی۔ رابعہ نے لکھا تھا :

پیارے اللہ میاں جان

آپ کو تو پتا ہی ہوگا میرے ابو آپ کے پاس چلے گئے ہیں۔ میری امی جان اور میں خود ان کے بچھڑنے سے افسردہ ہیں۔ ابو کہتے تھے : "سب چیزیں اللہ کی امانتیں ہیں۔ سب کو ایک دن اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔" میرے ابو اچھے تھے مجھے پورا یقین ہے وہ آپ کے ہاں خیریت سے ہوں گے اور جنت میں ہوں گے۔ امی آج کل بہت پریشان ہیں۔ وہ کہتی ہیں۔ "تمہارے ابو کے مرنے کے بعد اب کیا ہوگا؟ گھر کا خرچہ کس طرح چلے گا؟؟ ابو کہتے تھے۔ "روزی اللہ دیتا ہے۔" تو امی جان کیوں فکر کرتی ہیں؟ وہ اللہ پر بھروسہ کیوں نہیں کرتیں......؟؟ وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ حالات ایسے خراب رہے تو ہمارے وطن پاکستان کا کیا ہوگا؟"

رابعہ یہیں تک لکھ پائی تھی کہ اسے نیند آگئی۔ آخری جملے پڑھ کر رابعہ کی امی لرز اٹھیں۔ رابعہ نے ٹھیک ہی تو لکھا تھا کہ ان کو اپنے اللہ پر بھروسہ نہیں رہا تھا اس لئے روزی کے لئے اتنی پریشان تھیں۔ انہوں نے دل ہی دل میں اپنی کوتاہی پر اللہ میاں سے معافی مانگی۔

"سلائی کڑھائی تو مجھے آتی ہی ہے۔ میں کل سے یہی کام شروع کر کے رزقِ حلال کماؤں گی۔" انہوں نے خود سے...... کہا پھر اللہ کی بڑائی اور اس کی مدد کے خیال سے آجانے والے آنسو پونچھے، جھک کر رابعہ کے گالوں کا پیار کیا پھر آہستہ مگر بڑے سکون سے کہا۔

"رزق دینا تو اسی کا کام ہے اور جو ابرابہ کے لشکر سے اپنے گھر کو بچا سکتا ہے وہ پاکستان کو بھی دشمنوں کی سازشوں سے بچائے گا......وہی ہمارا مددگار ہے!!

ایک ضروری بات

صفحات میں کمی کی وجہ سے "موت کی آواز" کا آخری حصہ اس بار شامل نہ کیا جاسکا جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ اس سنسنی خیز دلچسپ کہانی کا آخری حصہ اکتوبر کے قلم دوست صفحات میں شائع کیا جائے گا۔ اسی طرح قسط وار کہانی "اس طرح تو ہوتا ہے" کا آخری ٹکڑا بھی آپ اکتوبر میں ملاحظہ کرسکیں گے۔

مُرغی کے نکمّے دوست

سیدہ افشاں افتخار

اونچا نیچا کھیت کا رستہ
آٹا مہنگا دانہ سستا

بی مُرغی کے گھر کا خرچہ
آخر ایسے کب تک چلتا

ایک دن بی مُرغی نے سوچا
کیوں نہ ناپوں کھیت کا رستہ

دانے توڑ کر پِسوا لوں گی
چکّی والے سے ہے ماموں کا رشتہ

یہ سوچ کر بی مُرغی نے بُلائے
اپنے دوست بطخ، بلّی اور کتّا

تینوں دوست تھے کاہل بالکل
سب سے پہلے بولا کتّا

ٹانگ میں میری چوٹ لگی ہے
اس لئے میں نہیں چل سکتا

بطخ، بلّی مِل کر بولیں
کام میں ہمارا دل نہیں لگتا

یہ سُن کر بی مُرغی کو
اس سے پہلے کہ غصّہ آتا

بچّے آگے بڑھ کر بولے
آخر ہم کس لئے ہیں، ماتا

یوں مُرغی اور بچّوں نے
پِسوا لیا آٹا سستا

شام کو جب روٹی پکی
تو بولے بطخ، بلّی اور کتّا

بی مُرغی ہم دوست ہیں تمہارے
کِھلا سکتی ہو تم، ہم کو کتنا

بی مُرغی ہنس کر یہ بولی
نِکمّوں کو حصّہ کبھی نہیں مِلتا

گدھا وزیر

رستم علی

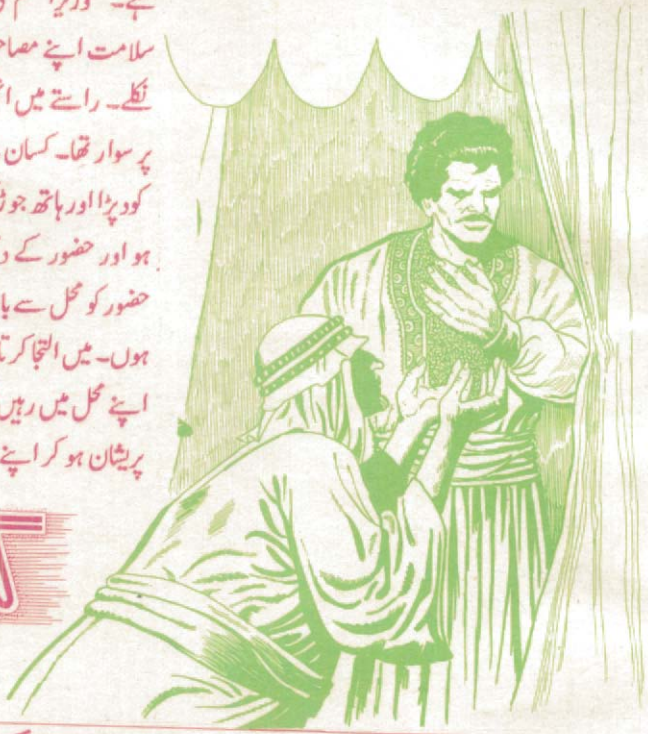

کسان نے کہا: "بادشاہ سلامت! یہ میرا نہیں بلکہ میرے گدھے کا کمال ہے جب موسم میں کسی ناخوشگوار تبدیلی کے آثار پیدا ہوتے ہیں تو وہ چند گھنٹے پیشتر ہی اپنے کان ڈھیلے چھوڑ دیتا ہے..!!"

سردیوں کے موسم میں ایک دن بادشاہ سلامت کے دل میں سیروشکار کا شوق پیدا ہوا۔ انہوں نے اپنے وزیر اعظم سے جو علم نجوم بھی جانتے تھے۔ موسم کا حال معلوم کیا۔ وزیر نے حساب لگایا پھر کہا "عالی جاہ! میرا علم یہ بتاتا ہے کہ موسم نہایت خوشگوار رہے گا۔ سارا دن دھوپ پڑے گی لیکن ہوا بھی چلتی رہے گی۔ سیروشکار کے لئے اس سے اچھا دن کوئی نہیں ہو سکتا ہے۔" وزیراعظم کی بات کی روشنی میں بادشاہ سلامت اپنے مصاحبوں کے ساتھ شکار کے لئے نکلے۔ راستے میں انہیں ایک کسان ملا جو گدھے پر سوار تھا۔ کسان بادشاہ کو دیکھتے ہی گدھے سے کود پڑا اور ہاتھ جوڑ کر چلّایا۔ "حضور کا اقبال بلند ہو اور حضور کے دشمن جنہوں نے آج کے دن حضور کو محل سے باہر نکلنے کا مشورہ دیا ذلیل وخوار ہوں۔ میں التجا کرتا ہوں کہ آج کے دن آپ اگر اپنے محل میں رہیں تو بہت اچھا ہوگا۔" بادشاہ نے پریشان ہو کر اپنے وزیر کی طرف دیکھا اور وزیر

اعظم نے کہا۔ جہاں پناہ! آپ ایک پاگل آدمی کی باتوں پر توجہ نہ دیں۔" وزیر اعظم کی بات سُن کر بادشاہ سلامت نے اپنے سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ پھر حکم دیا : "اس پاگل کو جوتے رسید کئے جائیں۔" بادشاہ کا حکم سنتے ہی سپاہیوں نے کسان بیچارے کی جوتوں سے تواضع کردی۔ کسان کی مرمّت کرانے کے بعد باشادہ سلامت تھوڑی ہی دور پہنچے تھے کہ اُفق سے آندھی کے آثار دکھائی دیئے۔ آن کی آن میں آسمان پر تاریکی چھاگئی اور بادو باراں کے طوفان کے ساتھ اولے پڑنے لگے۔ جنگل میں بادشاہ سلامت کے لئے سر چُھپانے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی وہ پانی اور کیچڑ میں لت پت ہوگئے۔ لت پت ہونے کے بعد سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ اور اس مصیبت میں مبتلا ہونے کے بعد اگر ان کے دل میں کوئی خیال آسکتا تھا تو وہ یہ تھا کہ نالائق وزیر کے لئے بدترین سزا اور کیا ہو سکتی ہے قصہ مختصر جب وہ اپنے محل میں پہنچے تو اطمینان کا سانس لیتے ہی دو فرمان جاری کئے ایک یہ کہ وزیر اعظم کا منہ کالا کر کے شہر میں پھرایا جائے اور اس کے بعد اسے کال کوٹھری میں بند کردیا جائے دوسرا یہ کہ وزارت کا عہدہ سنبھالنے کے لئے اس کسان کو تلاش کیا جائے جسے کچھ دیر قبل جوتے مار مار کر گنجا کردیا گیا تھا۔ ان احکام کی فوراً" تعمیل کی گئی جب کسان بادشاہ کے دربار میں پیش ہوا تو اسے خوشخبری سنائی گئی کہ تم وزیر اعظم بنادیئے گئے ہو۔ اس نے گھبرا کر کہا "عالی جاہ! میرے ماں باپ آپ پر قُربان مجھے کس جرم کی سزا دی جارہی ہے۔؟" بادشاہ سلامت نے جواب دیا "یہ سزا نہیں بلکہ انعام ہے تم اس دور کے سب سے بڑے نجومی ہو اور ہمیں وزیر اعظم کی حیثیت سے تمہاری خدمات کی ضرورت ہے۔" "عالی جاہ! میں خدا کو حاضر و ناضر جان کر کہتا ہوں کہ میں نجومی نہیں ہوں۔" بادشاہ نے حیران ہو کر کہا۔ "تم کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہو۔" کسان نے جواب دیا۔ "عالی جاہ! کسرِ نفسی سے کام نہیں لے رہا اگر میں نجومی ہوتا تو آج حضور کے راستے سے گزرنے کی حماقت نہیں کرتا۔" "اگر تم نجومی نہیں ہو تو تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ آج بارش ہوگی۔"

کسان نے جواب دیا "بادشاہ سلامت! یہ میرا نہیں بلکہ میرے گدھے کا کمال ہے۔ جب موسم میں کسی ناخوشگوار تبدیلی کے آثار پیدا ہوتے ہیں تو وہ چند گھنٹے پیشتر ہی اپنے کان ڈھیلے چھوڑ دیتا ہے۔ آج تو اس کے کان بہت ڈھیلے تھے ..... اور جب آپ گزرے تو .....!!" "ٹھیک ہے!" بادشاہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آج سے تمہارا گدھا ہمارا وزیر اعظم ہے!!"

علم بڑی دولت ہے

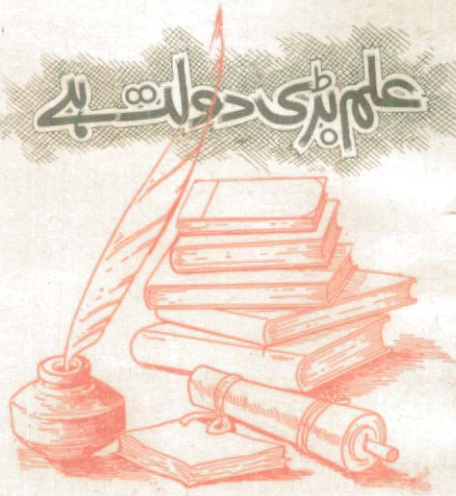

اسکول کے اکثر بچے مضمون لکھنے سے بہت گھبراتے ہیں۔
گھبرائے ہوئے بچوں کے لیے آنکھ مچولی نے آسان عام فہم زبان میں
مضامین کا نیا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا مضمون پیش خدمت ہے۔
اسے دسویں جماعت کے ہونہار طالبعلم محمد اظہر خان نے لکھا ہے۔

کوئی چاہے کتنا ہی بڑا بادشاہ ہو۔ اس کے پاس کتنی ہی دولت ہو لیکن خرچ کرنے پر وہ ساری دولت ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دولت کو چور چرا بھی لیتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی دولت ایسی ہو جو خرچ کرنے پر نہ تو ختم ہو اور نہ جسے کوئی چور چوری کر سکے؟ اس کا سیدھا سا جواب ہے۔ ”علم کی دولت“ علم وہ دولت ہے جسے جتنا بھی خرچ کیا جائے کم نہیں ہوتا بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوتا ہے پھر یہ وہ خزانہ ہے جسے دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا چور بھی نہیں چرا سکتا۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی اہمیت پر بڑا زور دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ ”علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔“ علم کا مطلب ہے ”جاننا“ علم ہی کی وجہ سے بندہ اللہ اور بندوں کے حقوق پہچانتا ہے قرآن مجید میں بھی جو سب سے پہلی آیات نازل ہوئیں وہ علم سے ہی متعلق ہیں۔

علم اللہ کا انسان پر بڑا احسان ہے۔ اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے علم کی دولت سے نوازتا ہے۔ علم سے انسان کی عزت ہوتی ہے........دنیا میں جاہلوں کی تعداد ہمیشہ سے زیادہ رہی ہے لیکن علم والے ہی دنیا پر حکومت کے اہل مانے گئے۔

حضرت سلمان فارسیؓ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک دن دریائے دجلہ کے کنارے اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک شاگرد کو برتن دے کر کہا۔ ”اس میں پانی بھر لاؤ۔“ شاگرد گیا اور دریا سے پانی برتن میں بھر لایا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تمہارے پانی لینے سے دریا میں پانی کچھ کم ہو گیا؟“ شاگرد نے کہا ”ہرگز نہیں!“ حضرت سلمان فارسیؓ نے فرمایا۔ ”علم کی مثال بھی دریا کی سی ہے کہ اس میں سے جتنا بھی خرچ کیا جائے کم نہیں ہوتا۔“

علم کے ذریعے سے ہی انسان اپنے اللہ اور اپنی زندگی کے مقصد کو پہچانتا ہے۔ بندوں کے کام آنا، ان کی خدمت کرنا، علم ہی کی وجہ سے اس نے سیکھا ہے۔

مجھے اچھا لگا

وہ نوجوان

عبدالباسط — بہاولپور

صبح کا وقت تھا۔ ہم لوگ اسلام آباد سے لاہور جارہے تھے۔ ہم نے سفر کے لئے اے سی کوچ کا انتخاب کیا تھا جس میں سفر کی دوسری سہولتوں کے علاوہ ٹیلی وژن بھی مہیا تھا۔ میں نے ایک نظر مسافروں پر ڈالی اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد سفر شروع ہوا تو ساتھ ہی میرے کانوں سے موسیقی کی آواز ٹکرائی دیکھا تو ڈرائیور نے ٹیلی وژن پر کوئی انڈین فلم لگادی تھی جس میں بے سروپا گانے کے ساتھ ایک بے ہودہ رقص چل رہا تھا۔ مجھ سے اگلی سیٹ پر دو نوجوان بیٹھے ہوئے تھے میں نے محسوس کیا تھا کہ فلم شروع ہوتے ہی ان کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی ہے تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک نوجوان اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر زبردست غصّے کے آثار نمایاں تھے لیکن اس نے نہایت تحمل سے ڈرائیور سے کہا

"چرار شریف کا سانحہ ہوئے کچھ ہی دن گزرے ہیں۔ اس سے پہلے بابری مسجد کا المناک واقعہ پیش آچکا ہے مگر آپ لوگوں کے ضمیر اب تک سورہے ہیں اور دشمن ملک اپنے بے ہودہ رقص دکھا کر مسلمانوں میں جوش وولولہ ختم کرنا چاہتا ہے۔ جو کشمیریوں پر ہونے والے ظلم وستم کو دیکھ کر ان کے دل میں پیدا ہوجاتا ہے۔ انفرادی سطح پر جو مرضی کریں لیکن کم از کم اجتماعی سطح پر تو اس مکروہ فعل سے پرہیز کریں۔" نوجوان کی آواز جذبات سے بوجھل ہورہی تھی۔ کچھ دوسرے نوجوان بھی اس کی تائید میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

لہٰذا مجبوراً ڈرائیور کو فلم بند کرنی پڑی۔ سب لوگ اس نوجوان کو پُرستائش نظروں سے دیکھ رہے تھے اور وہ نوجوان اپنے ساتھی کے ساتھ خاموش بیٹھا تھا۔ لوگوں کی پُرستائش نظروں سے بے نیاز وہ نوجوان مجھے بہت اچھا لگا۔ اس نوجوان کا بھری بس میں وی سی آر پر بیہودہ فلم کو بند کرادینے کا وہ لمحہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

ڈول ڈلیل

شاعر: صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

انتخاب: شہیرا احمد صدیقی

ایک کے پاس ہے کھوٹا سکّہ ایک کے پاس ہے دس کا نوٹ
ایک کے ابا صرف گھسیٹا ایک کے والد میر چھوٹ
ایک نے دیکھا شہر کراچی ایک نے دیکھا مِتھن کوٹ
ایک ہے اپنی بات کا سچّا ایک ہے پورا جھوٹ کی پوٹ
ایک نے کھائی آدھی روٹی ایک نے کھایا پورا رَوٹ
ایک کے پاس ہے دو گز دھاگہ ایک کے پاس ہے ڈور کی گوٹ
ٹھن گئی آپس میں دونوں کی لڑے اُتار کے دونوں کوٹ
ایک کی ٹانگ کی ہڈّی ٹوٹی
ایک کے سر پر آئی چوٹ

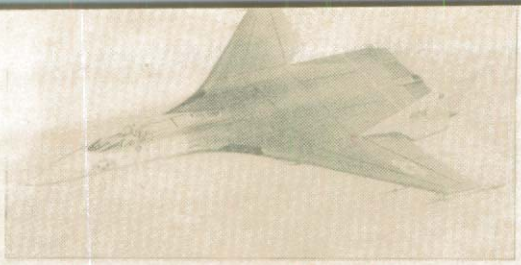

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا

شاہین نے ہوا میں چند غوطے لگائے اور پھر چند گولے داغ دیئے۔ فضا دھماکوں سے لرز اُٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے صرف تیس سیکنڈ میں بُزدل دشمن کے پانچ طیارے ایک دھماکے کے ساتھ زمین بوس ہوگئے..!!

چھ ستمبر کی صبح ہے.....لوگ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کاموں پر جانے کی تیاریاں کررہے ہیں اور کچھ مسجدوں سے نکل کر اپنے گھروں کا رُخ کر رہے ہیں.......

اچانک یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہزاروں توپیں ایک ساتھ داغی جارہی ہوں۔

پاکستان ایئر فورس کے چند ہوا باز گشتی پرواز کے لئے تیار ہیں۔ سامنے آسمان پر آگ کے چھ گولے سرگودھا ایئر بیس.......کی طرف بڑھ رہے ہیں بڑھنے والے آگ کے یہ گولے بھارتی سینا کے چھ لڑاکا طیارے ہیں جو جدید اسلحہ سے لیس ہیں۔ ابھی کوئی کچھ سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ P-A-F کا ایک شاہین فضا میں بُلند ہوا۔

آسمان کی فضا میں بُلند ہونے والا یہ شاہین ایم ایم عالم تھا۔ ایم ایم عالم بھارتی طیاروں کے پیچھے لگ گیا اور آناً فاناً تین گولے داغ کر تین بھارتی طیارے مار گرا لئے۔ باقی تین طیارے فرار ہوگئے۔

ابھی شاہین پلٹا ہی تھا کہ اپنے آپ کو کئی طیاروں کے درمیان گھرا ہوا پایا۔ شاہین نے ہوا میں کچھ غوطے لگائے اور پھر چند گولے داغ دیئے۔ فضا دھماکوں سے لرز اُٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے صرف تیس سیکنڈ میں بُزدل بھارت کے پانچ طیارے ایک دھماکے کے ساتھ زمین بوس ہوگئے۔ جیالے شاہین ایم ایم عالم کا یہ کارنامہ دنیا کی تاریخ میں ایک ریکارڈ کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ اس طرح جو طیارے ہمیں شکار کرنے آئے تھے خود ہمارے جیالے شاہین کا شکار ہوگئے!!

ایک اعلان

جولائی ۹۵ء سے قلم دوست صفحات میں بہترین تحریر، بہترین نظم کے سلسلے میں تھوڑی سی تبدیلی کردی گئی ہے۔ اب آپ قلم دوست صفحات میں کہانی، مضمون، نظم، ڈرامہ، انٹرویو میں سے صرف کسی ایک بہترین تحریر کو منتخب کریں گے۔ اس بہترین تحریر کے مصنف کو تحفے میں ایک خوبصورت فاؤنٹین پین دیا جائے گا نیز بہترین تحریر منتخب کرنے والے تین ساتھیوں کو آنکھ مچولی کا تازہ شمارہ اعزازی روانہ کیا جائے گا۔

☆ مارچ کی بہترین تحریر "کہانی اچھی تھی ناں۔" بہترین نظم "ٹیپو کی تلوار ہو تم" بذریعہ قرعہ اندازی انعام حاصل کرنے والی خوش نصیب صدف مظفر، راولپنڈی۔

☆ اپریل ۹۵ء کی بہترین تحریر "اپنی دنیا آپ پیدا کر" بہترین نظم "دو دوست" بذریعہ قرعہ اندازی انعام حاصل کرنے والے خوش نصیب اسد اللہ، کراچی۔

☆ مئی ۹۵ء کی بہترین تحریر "مسافر کی کہانی"۔ بہترین نظم "اسکول نہیں جاؤں گا" بذریعہ قرعہ اندازی انعام حاصل کرنے والے خوش نصیب اُسامہ بن مبارک، راولپنڈی۔

☆ جون ۹۵ء کی بہترین تحریر "درد دل کے واسطے" بہترین نظم "بوریوالہ ایکسپریس" بذریعہ قرعہ اندازی انعام حاصل کرنے والے عبدالبشیر، کراچی۔

ادیب بتائیے انعام پائیے (نتائج)

مئی ۹۵ء کے خاص نمبر قلم دوست میں دو دلچسپ مزے دار کہانیاں شائع کی گئیں جنہیں دو بڑے ادیبوں نے لکھا تھا۔ ان میں سے "مسافر کی کہانی" کے مصنف تھے قومی ترانہ کے خالق جناب ابو الاثر عبدالحفیظ جالندھری (مرحوم) جنہوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی نام پیدا کیا جبکہ دوسری کہانی "دُم کٹا چوہا" کے مصنف مشہور شاعر و ادیب جناب ابن انشا (شیر خان مرحوم) تھے۔ ابن انشا مرحوم نے نہ صرف مزاح نگاری بلکہ شاعری میں بھی نئے تجربے کیے۔ انہوں نے سفرنامے بھی لکھے جو ان کے اندازِ تحریر کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے۔ یہ دونوں شاعر و ادیب اگرچہ اب ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی زندہ تحریریں انہیں ادب میں اور دلوں میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

اس مقابلے میں ہمیں سینکڑوں ساتھیوں کے جوابات موصول ہوئے تھے۔ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس مقابلے کے نتائج میں تاخیر ہوئی جس کے لئے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ بذریعہ قرعہ اندازی دو ساتھیوں کو انعام کے لئے منتخب کیا گیا۔ (۱) محمد خالد آرائیں، نوابشاہ (۲) رضوان احمد، کراچی۔

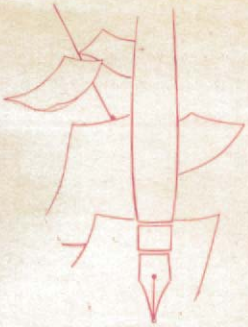

آخری بات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔"

جب ہم بہت چھوٹے تھے اور چل پھر نہیں سکتے تھے نہ اپنے آپ کچھ کھا پی سکتے تھے۔ اس وقت ہمارے ماں باپ نے ہماری دیکھ بھال کی۔ وقت پر ہمیں کھلایا پلایا اور ہماری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔

ماں باپ کی وجہ سے ہم چلنے پھرنے، پڑھنے لکھنے اور کام کرنے کے قابل ہوئے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر طرح اپنے والدین کا خیال رکھیں ان کو کوئی تکلیف نہ ہونے دیں ان کا کہا مانیں۔ ان کو تنگ نہ کریں۔

ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے سے عمر میں برکت ہوتی ہے۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا "جو کوئی یہ چاہے کہ اس کی عمر لمبی ہو تو اس کو چاہئے وہ ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔" ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے آپؐ سے پوچھا "کون سا کام اللہ کو سب سے زیادہ پیارا ہے؟"

آپؐ نے فرمایا "وہ نماز جو وقت پر پڑھی جائے۔"

صحابیؓ نے پوچھا "اس کے بعد کون سا کام اللہ کو سب سے زیادہ پیارا ہے؟"

آپؐ نے فرمایا "ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔"

ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا "ماں باپ کو گالی دینا بہت بڑا گناہ ہے۔ وہ بندہ جو کسی کے ماں باپ کو گالی دے اور جواب میں وہ اس کے ماں باپ کو گالی دے۔"

اس طرح اس نے اپنے ماں باپ کو گالی دلوائی۔"

ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے ماں باپ کا ادب کریں۔ ان کا کہا مانیں۔ ان کو کبھی نہ ستائیں، جو اپنے ماں باپ کا ادب کرتا ہے اللہ اس سے بہت خوش ہوتا ہے!!

کُل عام وانتم بخیر

سعودی عرب کے جشنِ آزادی پر خصوصی سپلیمنٹ

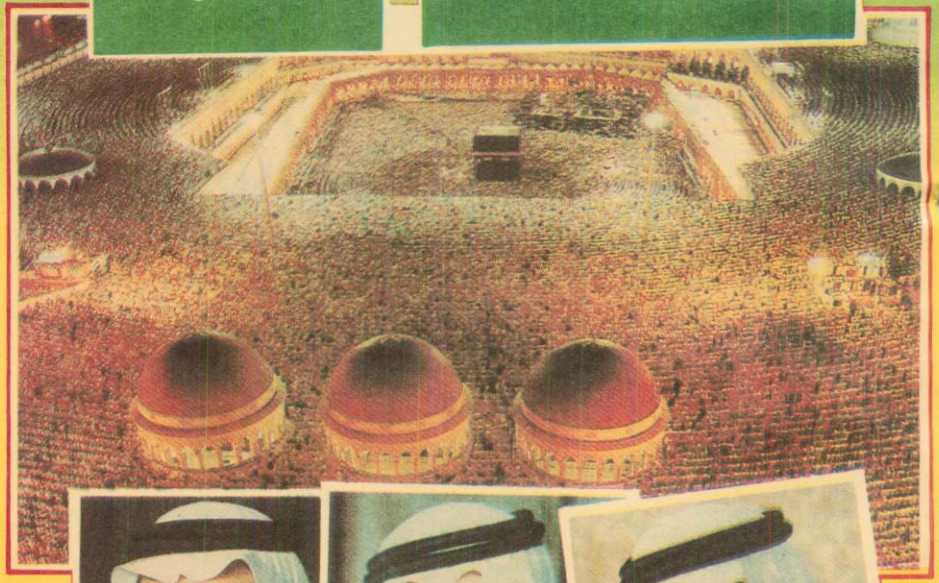

آگئے اس کی رحمت کے دامن میں سب

شوکت عابد

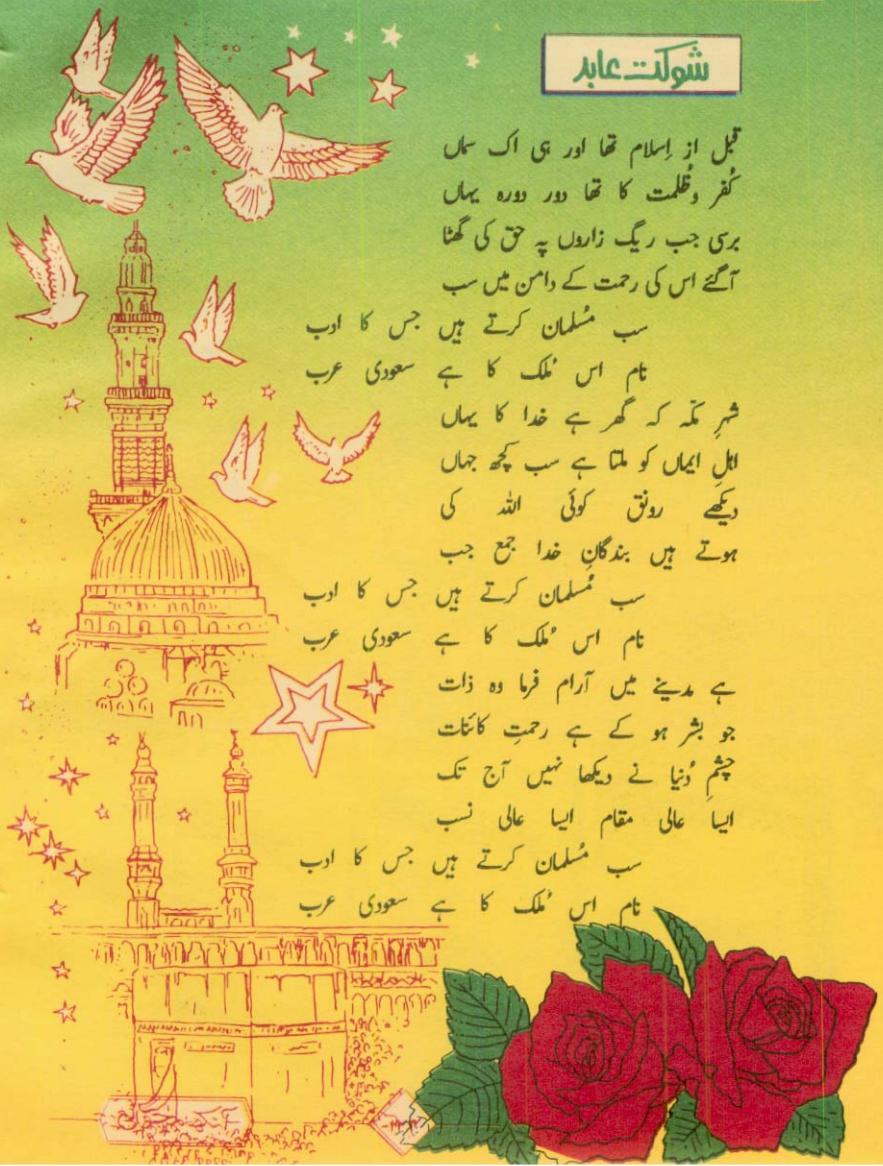

قبل از اِسلام تھا اور ہی اک سماں
کُفر و ظُلمت کا تھا دور دورہ یہاں
برسی جب ریگ زاروں پہ حق کی گھٹا
آگئے اس کی رحمت کے دامن میں سب

سب مُسلمان کرتے ہیں جس کا ادب
نام اس مُلک کا ہے سعودی عرب

شہرِ مکّہ کہ گھر ہے خدا کا یہاں
اہلِ ایماں کو ملتا ہے سب کچھ جہاں
دیکھے رونق کوئی اللہ کی
ہوتے ہیں بندگانِ خدا جمع جب

سب مُسلمان کرتے ہیں جس کا ادب
نام اس مُلک کا ہے سعودی عرب

ہے مدینے میں آرام فرما وہ ذات
جو بشر ہو کے ہے رحمتِ کائنات
چشمِ دُنیا نے دیکھا نہیں آج تک
ایسا عالی مقام ایسا عالی نسب

سب مُسلمان کرتے ہیں جس کا ادب
نام اس مُلک کا ہے سعودی عرب

رحمتوں کی سرزمین
سعودی عرب

سعودی عرب اسلامی دنیا کا واحد ملک ہے جو اپنی معینہ مدت سے بہت پہلے ہی اکیسویں صدی میں داخل ہوچکا ہے!!

تحریر و ترتیب : **الطاف حسین**

۱۳ جنوری ۱۹۰۲ء کو عرب کی تاریخ میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس دن خاندان آلِ سعود کے حکمراں عبدالعزیز بن عبدالرحمٰنؒ نے صرف دس ساتھیوں کی مدد سے ریاض کا قلعہ فتح کرلیا۔ بہادری کا یہ بے مثال کارنامہ سارے عرب کے لئے انتہائی حیران کُن تھا۔ ریاض فتح کرنے کے بعد عبدالعزیزؒ نے اپنی آبائی حکومت میں شامل وہ تمام علاقے فتح کئے جن پر ۱۸۸۱ء میں خاندانِ ابن رشید کے امیر حائل نے اس کے والد عبدالرحمٰن کو شکست دے کر قبضہ کرلیا تھا۔ نجد کے تمام علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد عبدالعزیز نے حجاز کی طرف رُخ موڑا اور کچھ ہی عرصہ میں حجاز بھی اس کی حکومت میں شامل ہوگیا اور پھر ۲۳ ستمبر ۱۹۳۲ء میں

عبدالعزیز آلِ سعودؒ نے "مملکت العربیۃ السعودیۃ" کے نام سے اس عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی جس کی

مثال عربوں نے گزشتہ سات سو سال میں نہ دیکھی تھی۔ عبدالعزیز آلِ سعودؒ کا دور حکومت ۱۹۵۳ء تک رہا۔ ان کی وفات کے بعد شاہ سعود بن عبدالعزیزؒ نے مملکت کا انتظام سنبھالا۔ ۱۹۶۴ء میں شاہ سعودؒ کی وفات کے بعد شاہ فیصل بن عبدالعزیزؒ سعودی عرب کے سربراہ بنے۔ اس دور میں سعودی عرب غیر ملکی قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ آپ نے آہستہ آہستہ ملک کی ساکھ بحال کی اور دس برس کی مختصر مدت میں وہ وقت آگیا جب امریکہ، پورا یورپ اور جاپان صحرانشینوں کے رحم وکرم پر تھا۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۵ء کو آپ کے بھتیجے فیصل بن مساعد نے آپ کو گولی مار کر شہید کردیا۔ آپ کی شہادت کے بعد شاہ خالد بن عبدالعزیزؒ جو اس وقت وزیراعظم کے عہدے پر فائز تھے، نے ان کٹھن حالات میں سعودی عرب کے حکمران کی حیثیت سے فرائض سنبھالے۔ آپ کے دورِ حکومت میں ملک کے اندر انتہائی وسیع پیمانے پر سماجی و اقتصادی ترقیاتی کام ہوئے۔ نیز سعودی معاشرہ کو قبائلی نظام سے نکال کر جدید سہولتوں سے مستفید معاشرہ میں ڈھالنے کے لئے پالیسیاں مرتب کی گئیں۔ اس دور میں اسلامی ممالک کے درمیان اتحاد کے لئے سعودی عرب کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ ۱۳ جون ۱۹۸۲ء میں آپ دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کرگئے اور موجودہ سعودی حکمران شاہ فہد بن عبدالعزیزؒ نے خادم حرمین الشریفین کی حیثیت سے مملکت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ آپ نے سعودی وسائل سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے سعودی عرب

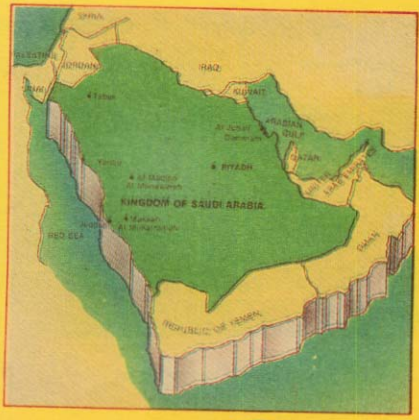

کے گوشے گوشے میں تعمیر و ترقی کے سنہری دور کا آغاز کیا۔ آپ کی سربراہی میں سعودی عرب جس تیزی سے ترقی کر رہا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ حرمین شریفین یعنی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی توسیع و ترقی کا خوبصورت منصوبہ آپ کی ذاتی توجہ اور مشاہدات و تجربات سے مکمل ہوا۔

ریاض ملک کا سیاسی دارالحکومت ہے جبکہ مکہ معظمہ کو دینی دارالحکومت کی حیثیت حاصل ہے۔ موسم گرما کے لئے طائف کو ثانوی دارالحکومت کا درجہ دیا گیا ہے۔

قومی اور سرکاری زبان عربی ہے۔ یہاں کا سکہ سعودی ریال کہلاتا ہے۔ سعودی عرب کا قومی پرچم سبز رنگ کا ہے جس میں سفید رنگ سے کلمہ طیبہ تحریر ہے اور نیچے تلوار بنی ہوتی ہے۔ جب کہ دو کراس

تلواریں اور کھجور کا درخت سعودی عرب کا قومی نشان ہے۔ یہاں کی اصل آبادی سو فیصد مسلمان ہے۔ اسلام کو سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہے۔ حجاز مقدس کے مشہور شہر مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، جدہ اور طائف ہیں۔ نجد کے خاص شہروں میں ریاض، البحریدہ، حائل، عنیزہ، یمامہ اور القصیم کا علاقہ شامل ہے۔ احساء میں جوف، ہفوف، جبرین، ظہران اور دمام جبکہ عسیر کے خاص شہروں میں نجران اور البھا تو مثل مری ہے۔

حجاز، نجد اور احساء میں کھجور بکثرت پیدا ہوتی ہے۔ مدینہ منورہ کی کھجوریں اپنی شیریں پن اور لذیز ہونے کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہیں جس کی تقریباً ایک سو اقسام ہیں۔ ان میں "عجوہ" کی تعریف تو خود حضور نبی کریمؐ نے بھی فرمائی ہے اور اسے زہر اور جادو میں مُفید قرار دیا ہے۔ کھجور کے درخت کی بُلندی ۲۰ سے ۳۰ فٹ تک ہوتی ہے۔ کچی کھجور بلح اور پکی اور لذیز کھجور "رطب" کہلاتی ہے۔ کھجور عربوں کی غذا کا سب سے اہم جُز ہے..... یہ پھل عربوں کی زندگی میں اس طرح داخل ہوگیا ہے کہ بہت سی چیزوں کی

مثالیں اس کے ذریعے دی جاتی ہیں.....

..... مثلاً "حصول عزت کو تم کھجور نہ سمجھو جسے باآسانی کھالیتے ہو" کھجور کے علاوہ دیگر نباتات میں

انگور، انار، سیب، بیری، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

زراعت میں تیز رفتار ترقی ہوئی ہے اور گندم سعودی عرب میں وافر مقدار میں پیدا ہوتی ہے۔ یہاں پائے جانے والے جانوروں میں اونٹ اور گھوڑے کو بہت اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی پرورش اور دیکھ بھال بہت اچھی طرح کی جاتی ہے۔ عربوں کے نزدیک سرخ اونٹ سب سے قیمتی سمجھے جاتے ہیں۔ اونٹ کے بعد عربوں کی زندگی میں جس جانور کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ گھوڑا ہے۔ عربی گھوڑے پستہ قد ہوتے ہیں۔ عام طور پر ان کا رنگ سفید بھورا اور سُرخی مائل ہوتا ہے۔

عرب بہت مہمان نواز قسم کے لوگ ہیں۔ مہمان کی انتہائی قدردانی ان کے یہاں ملتی ہے۔

تمام شہروں اور دیہاتوں کو بڑی بڑی شاہراؤں سے وسعت دے کر ملا دیا گیا ہے۔ اس میں سب سے بڑی شاہراہ "طریق ہجرۃ" ہے جس کے ذریعے نبی کریمؐ نے مکہ معظمہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تھی۔ یہ شاہراہ مکہ سے مدینہ منورہ جاتی ہے۔ اس کی کل لمبائی ۴۲۵ کلومیٹر ہے جس سے نکلنے والی برانچ روڈز ۴۰ سے ۷۶ کلومیٹر تک طویل ہیں۔

ان سرنگوں کے اندر وضو خانے، غسل خانے، بیت الخلا اور جائے نماز بنائی گئی ہیں۔ پیدل اور گاڑیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ راستے بنائے گئے ہیں۔

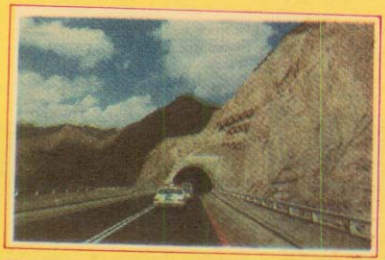

سعودی عرب جدہ کی اسلامی بندرگاہ اور دمام کی بندرگاہ کے ذریعے دنیا کے کئی ممالک سے مربوط ہے۔ جدہ کی اسلامی بندرگاہ مکمل کمپیوٹرائزڈ ہے۔ اس کے ۴۵ پلیٹ فارم ہیں اور ۱۵ لاکھ ٹن کی وسعت رکھنے والا گودام ہے۔ اس بندرگاہ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں اس کا وجود ملتا ہے۔ بحری راستے سے آنے والے حجاج اس بندرگاہ پر اترتے ہیں۔ اس طرح دمام سے ظہران تک ایک پل ۲۵ کلومیٹر لمبا بنایا گیا ہے جو سمندر پر واقع ہے یہ اپنی نوعیت کا اچھوتا شاہکار ہے۔

سعودی عرب کے ایئرپورٹس میں شاہ عبدالعزیزؒ ایئرپورٹ جدہ اور شاہ خالد ایئرپورٹ ریاض قابل ذکر ہیں۔ شاہ عبدالعزیز ایئرپورٹ جدہ کی تعمیر ۱۹۷۴ء میں

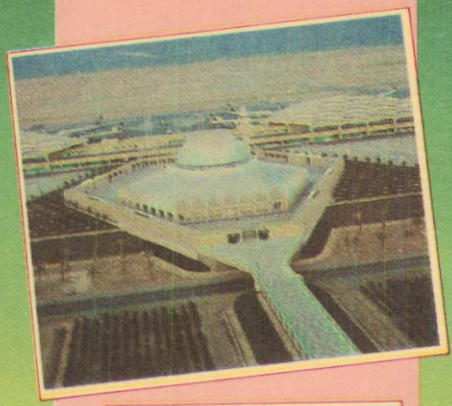

شروع ہوئی اور ۱۹۸۱ء میں مکمل ہوئی۔ ۱۰۵ مربع کلو میٹر کے وسیع رقبے میں پھیلے ہوئے اس ایئر پورٹ کے تین ہیں۔ ایک ٹرمینل سعودیہ ایئر لائن کی اندرون ملک پروازوں کے لئے مخصوص ہے۔ دوسرا ٹرمینل سعودی کی بیرون ملک پروازوں اور بین الاقوامی ایئر لائنز کے لئے، تیسرا صرف حاجیوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ یہ بیک وقت ۸۰ ہزار حاجیوں کے لئے کافی ہے۔ اسے فائبر گلاس کے خیموں کی شکل میں تیار کیا گیا ہے۔ جن کی تعداد ۲۱۰ ہے۔ ۱۹۸۳ء میں اسے آغا خان ایوارڈ برائے اسلامی آرکیٹیک دیا گیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ سائنسی بنیادوں پر قائم ہونے والا یہ ایئر پورٹ دنیا کی سب سے عمدہ اور جدید تعمیرات میں سے ایک ہے۔

ملک میں مواصلات کی سہولیات تسلّی بخش ہیں۔ خصوصاً ڈاک کا نظام نہایت عمدہ ہے۔

اسکول کی تعلیم کے تین مراحل (ابتدائی، وسطی اور ثانوی) ہیں۔ ثانوی تعلیم کے بعد کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کا بندوبست ہے۔ ملک میں تمام مراحل پر تعلیم مُفت دی جاتی ہے۔

سعودی عرب کے وسائل میں پیٹرولیم کو اہم مقام حاصل ہے۔ احساء میں بے شمار تیل کے کنویں دریافت ہوئے ہیں جن کی بدولت سعودی عرب کا شمار تیل کے بڑے برآمد کنندہ میں ہوتا ہے۔ دنیا کے کئی ممالک تیل کے خریدار ہیں۔ تیل کے ذریعے سعودی عرب کو سالانہ کثیر زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت بھی سعودی عرب میں کئی منصوبوں پر کام ہو رہا ہے۔

سعودی عرب اسلامی دنیا کا واحد ملک ہے جو اپنے

قدرتی وسائل کی وجہ سے اپنی معینہ مدّت سے بہت پہلے ہی اکیسویں صدی میں داخل ہو چکا ہے !!

کچھ یادیں کچھ باتیں

طارق فوزی مدیر منتظم آنکھ مچولی

یہ آج سے پندرہ سال پہلے کی بات ہے ان دنوں میں ایک ریفائنری میں ملازمت کرتا تھا۔ میرے دفتر کے ساتھی غفار اپنی والدہ کو حج پر لے کر گئے۔ حج سے واپس آنے کے بعد جب غفار ہمارے ساتھ لنچ پر بیٹھے تو مناسکِ حج کی تفصیل بتانے لگے۔ میں دم بخود ہو کر سُنتا رہا اور بعض دفعہ تو اتنا محو ہوا کہ جیسے خود ان مقاماتِ مقدسہ کی سیر کر رہا ہوں۔ انہی دنوں میری بہن فرخندہ میرے پاس آئی اور مجھ سے کہنے لگی کہ میرے اسکول میں خانہ کعبہ کی تصویر بنوانے کا مقابلہ ہے۔ آپ کی ڈرائنگ اچھی ہے۔ آپ تصویر بنادیں۔ میں ویسے ہی غفار کی روح افروز باتوں سے مُتاثر تھا اور اللہ کے گھر سے عقیدت بڑھ چلی تھی چنانچہ چھٹی والے دن ناشتہ کرتے ہی ایک عید کارڈ سے خانہ کعبہ کی خوب صورت تصویر نکالی۔ اس کو پلاسٹر آف پیرس پر ڈھالا پھر..... اس پر جو کام کیا وہ فِنشنگ کا تھا جس میں کافی محنت کی اور جب وہ تصویر تیار ہو گئی تو واقعی بہت اچھی لگی۔ میں فنّان نہیں تھا مگر فرخندہ کو اسی تصویر پر انعام ملا۔ اللہ کے گھر کی تصویر میرے دل میں بھی بن گئی تھی۔ اللہ کے گھر کی زیارت کا میرے دل میں بے حد شوق تھا لیکن "پتا نہیں میں وہاں جا بھی سکوں گا یا نہیں۔" میں یہ سوچ کر ہی رہ جاتا۔ ان ہی دنوں اخبار میں سعودی عرب کے لئے مارکیٹنگ کی جاب نکل آئی۔ میں نے فوراً" ہی درخواست دی اور اللہ کا کرنا ایسا ہوا

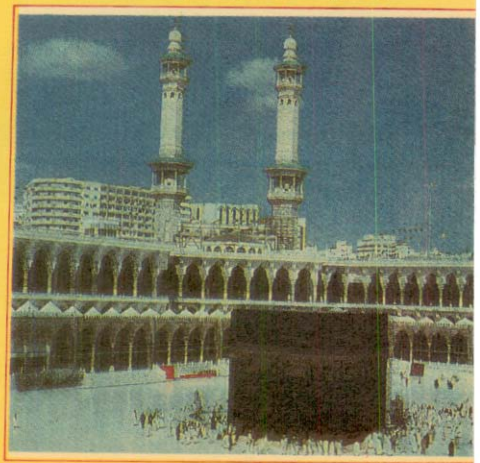

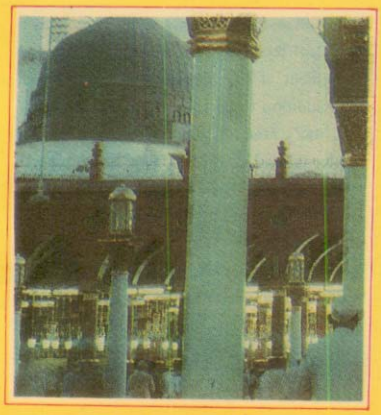

کہ مجھے منتخب کرلیا گیا۔ تمام مراحل جن میں انٹرویو سے لے کر سعودی عرب پہنچنا تک شامل ہے، بڑی خوش اسلوبی سے طے پائے اور پھر وہ دن بھی آگیا جب میں سعودی عرب کی سرزمین پر عمرہ کا احرام باندھے چمک دار.....صاف ستھرے ایئرپورٹ پر کھڑا تھا۔ عمرے کے بعد ایک رات مدینہ میں گزار کر میں جدہ واپس آگیا۔ میرے ذمے مارکیٹنگ کا کام لگایا۔ میرے فرائض میں بلڈنگ میٹریل فروخت کرنا تھا۔ جدہ میں میرا گاڑی کا لائسنس بنوا کر گاڑی دی گئی اور اگلے دن سے مجھے جدّہ کا نقشہ پکڑا دیا گیا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر کام شروع کردیا۔ ہمیں ایک شوروم دیا گیا جہاں میں فرصت میں بیٹھتا تھا۔ وہیں میرے (Client) آتے تھے اور بزنس کی بات وہیں طے ہوتی تھی۔ اللہ نے مقدّس سرزمین پر روزگار کا بندوبست کردیا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں کچی پکی عربی بھی آگئی۔ سعودیوں کے مزاج کا بھی اندازہ ہوگیا۔ نیا ماحول تھا نئی زبان مگر جدہ ایک مشترکہ شہر ہے جہاں آپ دنیا کی ہر بولی، لباس، تہذیب دیکھ سکتے ہیں۔ وہاں لوگ باہم شیروشکر رہتے ہیں۔ ایک دن جب کہ میں شوروم میں بیٹھا تھا، ایک سعودی شوروم میں داخل ہوا۔ چونکہ

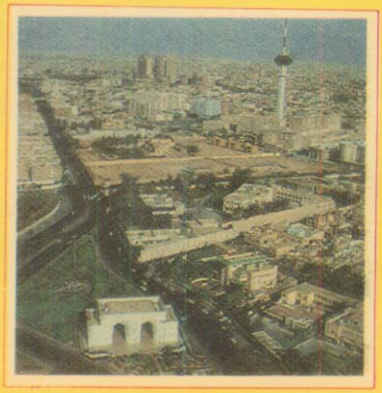

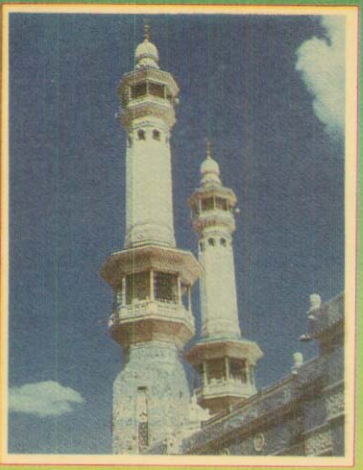

لباس سب کا ایک سا ہوتا ہے پتہ نہیں چلتا کہ بادشاہ کون ہے کون مزدور۔ عادت کے مطابق نہایت خوش گوار مُسکراہٹ لئے میں نے اس کا استقبال کیا۔ میں اس کو اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں مختلف مصنوعات کے ریٹ دیتا رہا اور "یا عمّی" یعنی میرے چاچا کہتا رہا جو میرے منہ سے ع کی جگہ ا نکلتا رہا۔ وہ میرے منہ سے یہ جملہ سُن کر زیرِلب مُسکراتا رہا۔ اس نے پاکستانی ماربل پسند کیا اور جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر مجھے دیا۔ میں نے کارڈ پڑھا اس کے آگے رینک لکھا تھا

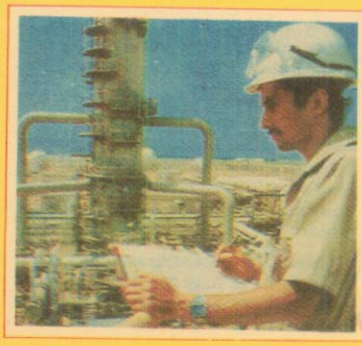

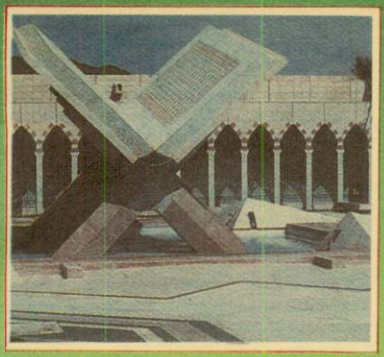

ثواب حاصل کرتے ہیں۔ نماز کے وقت تمام بازار بند ہوجاتے ہیں۔ رمضان کا مہینہ تو پورا کا پورا عید ہوتا ہے تمام بازار رات بھر کھلے رہتے ہیں۔ معلوم ہوا ڈھائی بجے رات آپ بنک میں کھڑے اپنا چیک کیش کرا رہے ہیں تمام بڑی بڑی سپر مارکٹیں رات میں رونق جمائے ہوتی ہیں' ٹریفک رواں دواں رہتا ہے۔ لگتا ہے شام سات بجے ہیں۔ لوگ روزے بھی رکھتے ہیں اور بے حد احترام بھی کرتے ہیں اسی طرح سعودی عرب میں قرآن بے حد پڑھا جاتا ہے۔ نماز باجماعت میں اگر پانچ منٹ کا بھی وقفہ ہوگا تو لوگ قرآن لے کر پڑھنے

بیٹھ جائیں گے۔ نفل آج تک کسی کو بیٹھ کر پڑھتے نہیں دیکھا پوچھنے پر معلوم ہوا اس سے نمائش ہوجاتی ہے کہ بندہ نفل پڑھ رہا ہے۔ حالانکہ عبادت کو بندے اور اللہ کے درمیان مخفی رہنا چاہئے۔ اکثر سعودی پیر اور جمعرات کا روزہ رکھتے ہیں۔ میرا کفیل تو خود مجھے روزے رکھنے کو کہتا تھا۔ سعودی کسی کے مذاق اُڑانے کو سخت ناپسند کرتے ہیں جب کہ ہمارے ہاں اکثر لوگوں میں یہ ہے کہ لنگڑا' کالیا' موٹا وغیرہ کہہ کر مذاق اڑایا جاتا ہے۔ سعودی غیبت سے بھی بہت بچتے ہیں بلکہ کبھی بات

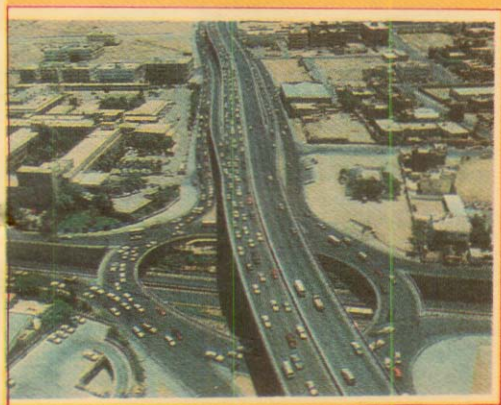

ہوجائے تو فوراً ٹوکا' کہا۔ "ھٰذا عیب یا طارق۔" افغانستان کا جہاد چل رہا تھا اور مسجدوں میں افغانستان کی امداد کے لئے بڑے بڑے صندوق رکھ دئے گئے تھے۔ ہمارے محلے میں سعودیوں سے جان پہچان ہوگئی تھی ایک نوجوان مسجد آیا کرتا تھا۔ وہ کافی عرصے نظر نہیں آیا۔ ایک دن اس سعودی کا چھوٹا بھائی شلوار قمیض میں ملبوس نظر آیا۔ میں نے حیرانگی سے سوال کیا "تم اور پاکستانی لباس؟" اور پھر میں نے یاد کرتے ہوئے اس سے پوچھا کہ تمہارا بڑا بھائی کہاں ہے؟ تو.....

.... اس نے بہت دھیمے لہجے میں بتایا کہ وہ افغانستان جہاد میں شریک ہے۔ پھر یہ چھوٹا لڑکا بڑے جوش سے

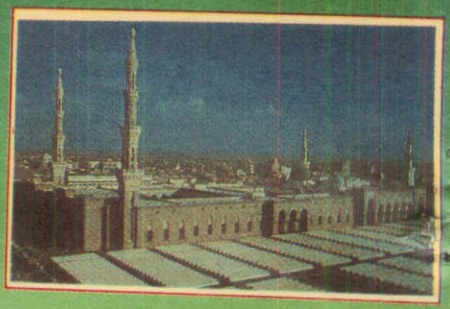

مال منگوا کر دے دیا تو بہت خوش ہوا اور پھر اس نے اپنے مکان کا پتہ دیا جو سمندر کے قریب بن رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا "وعدے پر پابندی بہت کم لوگ کرتے ہیں"۔ میں نے اس کے مکان پر جا کر چند ایک مشورے بھی دیئے۔ مکان بہترین صناعی کا نمونہ بن کے تیار ہوا۔ جنرل نے میری دعوت کی۔ وقتِ مقررہ پر میں وہاں پہنچا تو تمام عرب جمع تھے' بدو بھی تھے' سب نیچے فرش لگا کر بیٹھے تھے۔ جیسے ہی میں داخل ہوا تو جنرل خود چل کر آیا اور ہاتھ پکڑ کر مہمانوں کے قریب لے گیا اور میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ "یہ طارق فوزی ہے اور میں اس کی ماں ہوں۔" اس پر تمام عرب ہنس پڑے پھر جنرل نے واقعہ بتایا کہ میں اس کے شو روم میں گیا تو یہ مجھے "امی" کہتا رہا تھا لہٰذا میں اس کی ماں ہوں۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ کس طرح وہ جنرل اس وقت اپنی ہنسی دبا رہا تھا جب میں اس کو یا عمّی کے بجائے یا امّی کہہ رہا تھا۔ عربوں میں سلام کی بے حد اچھی عادت ہے آپ کو جانتے ہوں نہ ہوں مگر سلام آتے جاتے ضرور کریں گے۔ لفٹ میں اکثر جاتے وقت سعودی سلام کر کے داخل ہوتے ہیں اسی طرح نماز بھی ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ عام طور پر میں نے دیکھا کہ مغرب کی اذان ہوتی ہے اور صاف ستھرے فٹ پاتھ کے قریب ایک گاڑی پارک ہوئی۔ سعودی نے کار کی ڈگی سے ایک غالیچہ نکالا اور نماز شروع کر دی اور اور دیکھتے ہی دیکھتے مزید سعودی آئے اور وہ اس کے پیچھے نماز پڑھنے لگے اس طرح تمام لوگوں کی جماعت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر آپ کی جماعت نکل گئی ہے تو وہیں مسجد میں دوسری جماعت بعد میں آنے والوں کی بن جاتی ہے۔ اس طرح کافی لوگ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا

"جنرل" میں چونکا تو وہ خاصا محظوظ ہوا اور پھر اس نے پاکستانی ماربل کے لئے آرڈر بک کر دیا۔ اس دوران میری جنرل سے بے تکلفی بڑھ گئی۔ میں نے وقتِ مقررہ پر

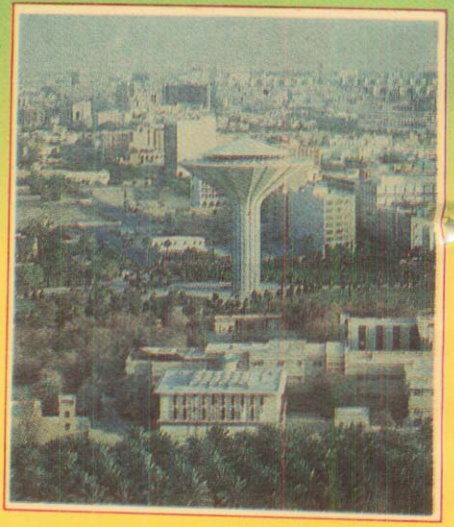

بولا کہ میں نے بھی جہاد کرنا ہے۔ اور میں وہاں شہید ہونا چاہتا ہوں۔

سعودی قانون کا بھی بے حد احترام کرتے ہیں۔ ایک دفعہ میں کار میں اپنے دفتر جارہا تھا۔ ایک چمکتی کار نے مجھے کراس کیا۔ اس میں کچھ سعودی نوجوان بیٹھے تھے اور بھی گاڑیاں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نوجوان نے کولڈ ڈرنک کا المونیم ٹین گاڑی کی کھڑکی سے باہر اُچھال دیا۔ اسی وقت ایک گاڑی تیزی سے باقی گاڑیوں کو اوور ٹیک کرتی آئی اور اس نے ان لڑکوں کی گاڑی کو جالیا پھر رکنے کا اشارہ کیا مجھے تجسس ہوا میں بھی سائڈ میں رک گیا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کار والا سعودی نوجوانوں کی اس حرکت پر ناراض تھا کہ انہوں نے وہ کولڈ ڈرنک کا ڈبہ کوڑے دان جو جگہ جگہ رکھے ہوئے ہیں اس میں کیوں نہیں ڈالا'

کہنے لگا۔ "تم سعودی ہو کر اس طرح کرو گے تو اجنبی باہر سے آکر رہ رہے ہیں ان کو کیا سکھاؤ گے۔" پھر اس نوجوان نے سوری کہہ کر پیچھے رہ جانے والے خالی ڈبے کو کوڑے دان میں ڈال دیا۔ اسی طرح اگر آپ کو چھینک آجائے اور آپ الحمدُللہ کہیں تو سعودی جواب میں یرحمک اللہ کہیں گے۔ نماز کے بعد تقبّل علی اللہ کہہ کر ہاتھ مِلائیں گے۔ اسی طرح مسلمان ممالک کے ساتھ ان کا برتاؤ بے حد اچھا ہے۔ اگر کوئی کسی کا پتہ پوچھے تو بڑے تحمّل سے بتاتے ہیں۔ منیٰ میں کسی حاجی کو نہیں جھڑکتے۔ ایک دفعہ میں نے حج کے موقع پر ایک شُرطہ (سپاہی) سے عربی میں کہا کہ یہ جو شیطان کے پاس حاجیوں کے جلسے کی جگہ ہوتی ہے' یہ افریقی راستہ بند کر کے کھانے پکاتے ہیں۔ ان کو کسی دوسری جگہ کیوں نہیں منتقل کرتے تو وہ نوجوان شُرطہ کہنے لگا۔ "نہیں یہ ضیوف الرحمان یعنی اللہ کے مہمان ہیں ان کو ہم کچھ نہیں کہتے یہ تو رحمت ہوتے ہیں۔" سعودی معاشرے میں غریبوں کا حد درجہ خیال رکھا جاتا ہے۔ رمضان میں بے پناہ زکوٰۃ بانٹی جاتی ہے۔ میں نے ایک سعودی دوست سے پوچھ لیا ٹھنڈا یا گرم تو وہ کہنے لگا کہ مہمان سے آئندہ یہ نہ پوچھنا وہ تو تکلّف ہی میں کچھ نہیں بتائے گا۔ لہٰذا جو گھر میں ہے وہ بلا تکلّف لاکر رکھ دیا کرو۔ یہ تھیں چند یادیں چند باتیں جو سعودیہ میں قیام کے دوران پیش آئیں۔ زندگی نے ساتھ دیا تو اور بھی بہت سے واقعات ہیں جو پھر سُناؤں گا.....!!

سچ مچ کا پاکستان

محمد اصغر احمد خان

"تم کون ہو؟"

"میں اریبہ ہوں..... اریبہ پاکستانی اور مجھے معلوم ہے تم رانیہ ہو رانیہ محمد ابراہیم عربی..... اور سعودی عرب سے آئی ہو لیکن تمہارا جہاز کِدھر ہے؟"

"میں جہاز میں بیٹھ کر نہیں بلکہ تتلی کی طرح اُڑتی ہوئی سعودی عرب سے یہاں آئی ہوں۔"

"اچھا اُڑتی ہوئی آئی ہو..... لیکن تمہارے پر کہاں ہیں؟"

"میرے پر نہیں اور شوق کے پر نہیں ہوتے۔ مجھے پاکستان دیکھنے کا شوق تھا سو میں یہاں چلی آئی۔"

"..... میں نے پاکستان کی بڑی تعریف سُنی ہے۔ میرے چچاؤں علی الحارثی اور حسین عبدالرحیم القریشی نے مجھے بتایا ہے کہ یہاں کے مسلمان بہت بہادر، محنتی، ایماندار، اور بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔"

"تمہارا ملک کب آزاد ہوا؟"

"ہمارا پیارا وطن پاکستان چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہوا اور مجھے معلوم ہے تمہارے وطن سعودی عرب کا یومِ جشنِ آزادی ۲۳ ستمبر ہے۔"

سب سے پہلے میں قائداعظمؒ کا مقبرہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے سنا ہے وہ بہت بہادر اور مخلص لیڈر تھے۔ انہی کی قیادت میں پاکستان بنا۔"

"تم آنکھیں بند کرلو اور ہاں آنکھ بند کرنے سے پہلے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لو ہم چند ہی لمحوں میں قائداعظمؒ کے مزار پہنچ جائیں گے۔"

"کیا تمہارے پاس کوئی جادو ہے؟"

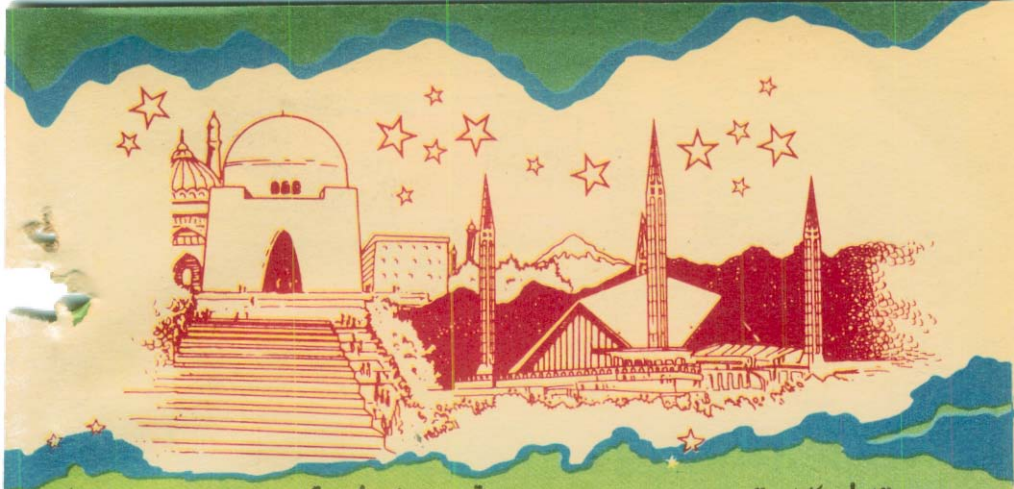

"ہاں! پیار کا جادو۔"

"اچھا یہ لو میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے اب کھول دو اپنی آنکھیں۔"

"ارے واہ! یہ تو واقعی مقبرہ آگیا..... یہ ہے قائداعظمؒ کا مقبرہ!"

----- ○ -----

"کلفٹن کی سیر سے تو تھک گئی بہرحال سیر کا مزا آگیا۔ جھولا بھی جھول لئے، کاریں بھی چلالیں۔ اب تو گرمی لگ رہی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو رانیہ! واقعی گرمی لگ رہی ہے!"

"آنکھیں بند کرو اور ہاں میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لو اب ہم لاہور چل رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں نے آنکھیں بند کرلیں۔"

"آدھا منٹ ہوگیا بس اب کھول دو آنکھیں۔"

"ارے واہ! یہ تو واقعی ہم دوسری جگہ آگئے۔"

"یہ کس کا مزار ہے؟"

"یہ علامہ اقبالؒ کا مزار ہے۔ انہیں شاعرِ مشرق کہا جاتا ہے۔ انہوں نے پورے عالمِ اسلام کے لئے شاعری کی ہے۔ پوری ملّت کا درد ان کی شاعری میں ہے۔ میں تمہیں ان کا ایک شعر سناتی ہوں :

"ہاں ہاں سناؤ۔ میں نے ان کے بارے میں اپنے چچاؤں سے بہت کچھ سُن رکھا ہے۔"

"سُنو" :

ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر

"واہ بھئی واہ! تمہیں تو ان کے شعر بھی یاد ہیں۔ یہ شعر سناتے ہوئے تو تم پوری "شاعرہ ملتانی" لگ رہی ہو۔"

"اچھا دیکھو یہ سامنے بادشاہی مسجد ہے اور وہ رہا لال قلعہ اور ادھر وہ کافی دور جو مینار نظر آرہا ہے..... وہ ہے مینارِ پاکستان۔"

---- ○ -----

"اچھا اب آنکھیں بند کرو اب ہم پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد جارہے ہیں۔"

"یہ لو بند کرلیں میں نے آنکھیں"

"ہاں ٹھیک ہے اب کھول دو۔"

"ارے! یہ تو فیصل مسجد ہے۔"

"ہاں یہ فیصل مسجد ہے اور یہ آپ ہی کے ملک کے فرمانروا شاہ فیصل بن عبدالعزیز نے بنوائی تھی۔"

"اللہ کتنی خوبصورت مسجد ہے۔"

----- ○ -----

"اسلام آباد کی خوب سیر کرلی تم نے اب آنکھیں بند کرو۔ ہم پشاور جارہے ہیں۔"

"ہاں کھول دو آنکھیں اب۔"

"ارے یہ راستہ کتنا خوبصورت ہے۔ اس میں تو دروازہ بھی لگا ہے۔"

"رانیہ! یہ درہ خیبر ہے۔"

"اچھا..... یہ..... درہ..... خیبر..... ہے!!"

"ارے..... ارے! یہ تمہیں کیا ہوگیا۔ آنکھیں کھولو ... لگتا ہے تم تھک گئی ہو۔"

"ہاں! میں تھک گئی ہوں .... جب ..... کوئی ..... مسلمان ..... تھک جائے ..... تو ..... دوسرا مسلمان اسے سہارا دیتا ہے ..... تم مجھے سہارا نہیں دو گی ..... پلیز مجھے سہارا دو ..... میں گر رہی ہوں ..... میں گر رہی ہوں .....!!"

"آنکھیں کھولو رانیہ کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"بھائی علی! لگتا ہے خواب میں ڈر گئی ہے یہ!!"

"شکریہ اریبہ .....! تم نے مجھے گرنے سے بچالیا۔"

"اریبہ .....!! میں اریبہ نہیں تمہارا چچا ہوں حسین عبدالرحیم القریشی۔"

"تو اریبہ کہاں گئی؟"

"اچھا سمجھ گیا ..... میں نے اسے اپنے پاکستانی دوست طارق کی بیٹی اریبہ کے بارے میں بتایا تھا اور کہا تھا کہ وہ اس سے دوستی کرنا چاہتی ہے۔ بس وہی خیال اس کے ذہن میں بیٹھ گیا اور اس نے خواب ہی خواب میں اریبہ کو دیکھ لیا۔"

"نہ صرف اریبہ کو دیکھ لیا بلکہ پاکستان کی سیر بھی کرلی ہے مجھے تو بہت اچھا لگا پاکستان ..... انکل! آپ لوگ جب پاکستان جائیں گے تو مجھے بھی ساتھ لے چلئے گا اب میں سچ مچ کا پاکستان دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"انشاء اللہ اگلی چھٹیوں میں ہم سب اپنے مسلم برادر ملک پاکستان جائیں گے۔"

"انشاء اللہ!!"

خدمتِ قوم کی توفیق ہو یا کعبے کی
یہ سعادت نہیں ملتی ہے بصد جِدّوجُہد
خدمتِ کعبہ پہ اللہ نے معمور کیا
مردِ حق، مردِ یقیں، شاہِ عرب، شاہِ فہد

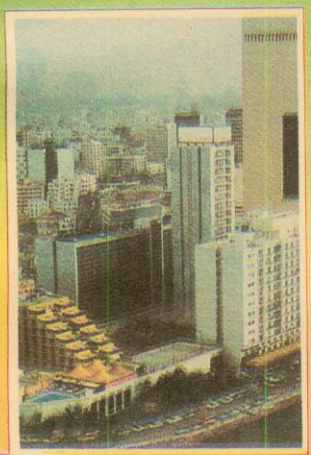

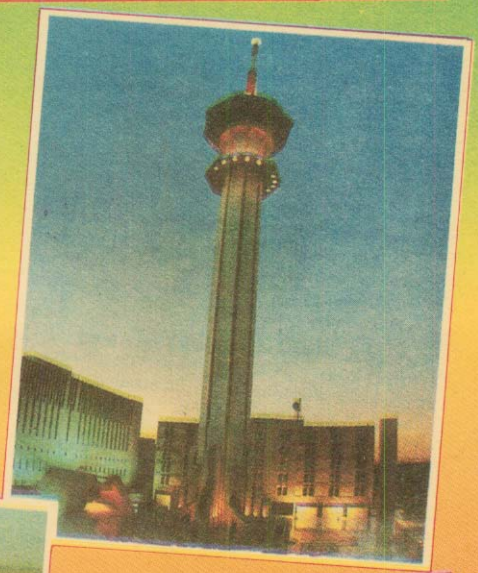

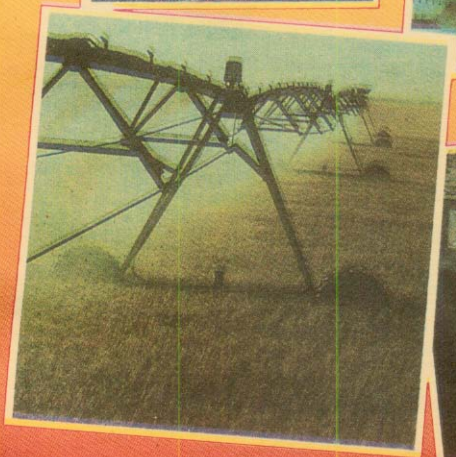

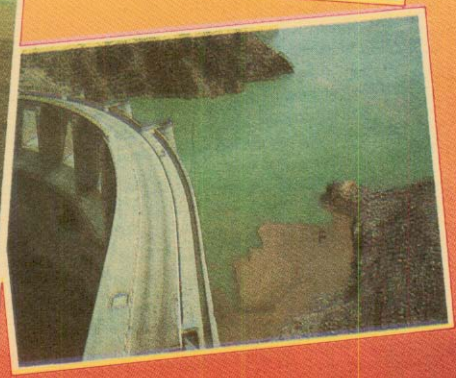

جس کی خوشبو بھی پیاری
جس کی لذّت بھی پیاری
جو ہے سب کی پسند
میری مٹھی میں بند
ہے کیا.... بتا دو نا

ناز پان مصالحہ

AP
ASHRAF PRODUCTS
P.O. BOX 3546, KARACHI-74800 PAKISTAN
CABLE: "TWO-IN-ONE" FAX: 021-7219548

REGD. No. M-266 SEPTEMBER 1995
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

APPETA Finger Chips

A -IS FOR APPETA

B -ECAUSE.... APPETA IS THE BEST

C -CHILDREN LOVE US

D ON'T BUY ANY OTHER CHIPS...

E NJOY APPETA

F -INGER CHIPS

ذائقے کی دنیا میں
A IS THE APPETA

32-33, Industrial Triangle Estate, Kahuta Road, Islamabad, Pakistan. Phone: 51-490471-4 (PABX-4 Lines) Fax: 51-491117-4, Telex: 54421 A. R. PK.